کسی دن

اقبال مجید

نیا سفر پبلیکیشنز
الہ آباد

کسی دن

ناول

❋

اقبال مجید

مصنف : اقبال مجید

اشاعت : جنوری ۹۸ء

تعداد : پانچ سو

قیمت : ۸۰ روپے

کتابت : شارپ ٹریک کمپیوٹرس، الہ آباد

طباعت : سرسوتی آفسٹ پریس، الہ آباد

Institute of Third World
Art & Literature
16 Winderemere Road
U.K.

ناشر : نیا سفر پبلی کیشنز
68 MIRZA GHALIB ROAD
ALLAHABAD-3

ملنے کے پتے :-

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی

۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ شمشاد مارکٹ۔ علی گڈھ

۳۔ نصرت پبلیشرز۔ امین آباد۔ لکھنو

۴۔ کتابستان۔ کریلی۔ الہ آباد

سچائی کی جستجو مطلوبہ سچائی کی جستجو نہیں ہوتی

البیر کامو

(۱۹۱۳ـ۶۰)

عرض ناشر

زیر نظر ناول کسی دن آج کے ہندوستان کی کہانی ہے وہ ہندوستان جو صرف شہر تک محدود نہیں بلکہ دیہات و قصبات کی وسیع و عریض اور زمین و جائداد، سیاست اور طاقت کی صورتوں میں ہے لیکن یہ سب مقامات کل کے نہیں بلکہ آج کے ہیں جہاں کے سیاسی سماجی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار بدل چکے ہیں جہاں پوری ایمانداری سے بے ایمانی ہو رہی ہے۔ پوری بے شرمی سے سیاست اور تشدد کا برہنہ کھیل ہو رہا ہے، جہاں رشتوں کا تقدس، نیکی کی قوتیں انسانی واخلاقی قدریں سب پامال ہو کر طاقت دولت اور صارفیت کا حصہ بن رہی ہیں یا بن چکی ہیں اور ان سب کا شکار ہے عام آدمی اور وہ شریف آدمی جو اپنی شرافت اور احترام آدمیت کو گلے لگائے صحت مند افکار اور روشن اقدار کے سائے میں جینا چاہتا ہے لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ پورا معاشرہ بلکہ پوری زندگی دوھرے پن اور کھوکھلے پن کا شکار ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہ دوراہے پر کھڑا ہے۔ تبدیلی کی ایک ایسی صورت ہے کہ جس کی راہیں کھلی ہو کر بھی مسدود ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔ ایسی تقلیب و تغیر کو اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور اب ناول نگار اقبال مجید کے صحت مند ذہن نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سمجھا ہے اور اکثر و بیشتر اس کا حصہ بھی بنے ہیں کہ وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جہاں دونوں صورتیں ان کے سامنے رہی ہیں اور ان متبدل صورتوں کے اسباب کا بھی بڑی حد تک انھیں علم ہے اور شاید غم بھی، اسی لئے ان کے مضبوط و مشاق قلم نے ان صورتوں کو اپنی تمام تر جولانیوں اور تخلیقی قوتوں کے ساتھ پہلی بار ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔ شاید اسی لئے کہ آج کے مسائل اتنے گمبھیر اور مسلسل ہیں اور ان کی جڑیں اسقدر گہری ہیں کہ افسانہ کا چھوٹا کینویس اس کا متحمل نہیں۔ غالباً اسی لئے اس دور میں ناول نگاری کا رجحان بڑھا ہے اور اب جب کہ اس صف میں اقبال مجید جیسے صفِ اوّل کے فنکار کھڑے ہو گئے ہیں تو یقین ہے کہ یہ صنف مزید پایۂ اعتبار تک پہنچے گی۔

اپنی منفرد مخصوص اور دلکش اسٹائل میں لکھا ہوا یہ ناول کچھ عرصہ قبل تیر ااور اس کا سچ کے عنوان سے شب خون (۲۰۳) میں شائع ہو کر توجہ اور بحث کا مرکز بن چکا ہے اور اب تخلیق کار کے ترمیم و اضافہ اور بدلے ہوئے عنوان کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کرنے کی سعادت ادارۂ نیا سفر کو حاصل ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ ناول نویسی کے جدید دور میں اس ناول کو وہ مقبولیت اور پذیرائی ضرور ملے گی جس کا کہ یہ حقدار ہے۔

علی احمد فاطمی

لکھنؤ کے اجاڑ کافی ہاؤس

اور

اُس پیاری دوستی کے نام

جس کے ہاتھوں

یہ خراشیں ملیں اور کام آئیں

پیش گفتار

تصنیف کی ابتدائی منزل میں ہی اس مختصر ناول کے چند صفحات کی اشاعت " سڑی ہوئی ٹھائی " کے عنوان سے سوغات (بنگلور) کے شمارہ نمبر ۱۰ میں ہو چکی تھی۔ ناول کی تکمیل پر اسکا مسودہ جناب محمود ایاز مرحوم نے پڑھا اور سوغات کے کسی قریبی شمارے میں شائع فرمانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ صد افسوس کہ انکی مہلک بیماری کے سبب سوغات کی اشاعتیں غیر یقینی ہو گئیں۔ بعد میں محترم شمس الرحمن فاروقی سے میں نے اسے پڑھنے کی درخواست کی جنھوں نے اسے ازراہ نوازش ماہنامہ شب خون برائے ماہ فروری ۱۹۹۷ کے شمارے میں شائع فرمایا۔

برادر علی احمد فاطمی نے جب اسے کتابی شکل میں شائع فرمانے کی خواہش ظاہر کی تو مجھے لگا کہ ناول پر نظر ثانی کیا جانا بہتر ہو گا۔ اسی کے ساتھ چند کرداروں کے کچھ اور پہلو مؤثر کئے جانے کے امکانات بھی نظر آئے لہذا قدرت اللہ، عائشہ بیگم اور ممّو خاں کے باب میں کچھ مزید اضافے بھی کئے گئے۔ جن قارئین اکرام نے شب خون کے صفحات پر اس ناول کا مطالعہ فرمایا ہے امید ہے انھیں یہ اضافے خوشگوار محسوس ہونگے۔

یہ اعتراف کرتے ہوئے مجھے خوشی ہے کہ جن افکار و خیالات کی روشنی میں یہ افسانوی فکر تخلیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں جناب اصغر علی انجینیر، جناب سعید نقوی جناب موہن گوسوامی، مولانا وحید الدین خاں صاحبان کے مضامین اور جناب گیانیندر پانڈے کی تالیف Hindus and Others کے چند مضامین کے نکات سرِ فہرست ہیں جنکا میں شکر گزار ہوں۔ برادرم شہریار صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنکی ایک اثر انگیز نظم نے اس تحریر کو رونق بخشی۔ بھائی علی احمد فاطمی کا تو خصوصی طور پر ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت کے دردِ سر کو انتہائی فراخ دلی سے قبول فرمایا۔

اقبال مجید

بھوپال

۱۶/اگست ۹۷ء

مصنف کے کوائف

نام : اقبال مجید

ولدیت : جناب عبدالمجید صاحب (مرحوم)

پیدائش : ۱۲جولائی ۱۹۳۴ء مراد آباد (یوپی)

تعلیم : ایم۔اے (سیاسیات) بی ایڈ (علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

پیشہ : آل انڈیا ریڈیو میں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے سے سبکدوش

بحیثیت سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال (اکتوبر ۹۲ء سے اکتوبر ۹۳ء تک تقرر رہا)

پتہ : ۱۳۲۔Bہاؤسنگ بورڈ کالونی، کوہ فزا، بھوپال

تصانیف

۱۔دو بھیگے ہوئے لوگ (افسانوی مجموعہ) سنہ اشاعت ۔۱۹۷۰ (نصرت پبلشرز لکھنو)

۲۔ایک حلفیہ بیان (افسانوی مجموعہ) سنہ اشاعت ۱۹۸۰ (نصرت پبلشرز لکھنو)

۳۔شہر نصیب : (افسانوی مجموعہ) سنہ اشاعت ۱۹۹۷ (معیار پبلیکیشن نئی دہلی)

۴۔کتے (اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ) زیر طبع

تراجم

بین الاقوامی معیار کی افسانوی تالیفات میں انگریزی وروسی زبانوں میں

تراجم کے ساتھ شمولیت

ڈرامے

کئی اسٹیج ڈراموں کی تصنیف وہدائت کاری

انعامات واعزازات

۱۔ مدھیہ پردیش اردو اکادی کی جانب سے ۹۱۔۹۰ء میں مجموعی ادبی خدمات پر کل ہند سطح کا میر تقی میر ایوارڈ

۲۔ ریڈیو کے سالانہ انعامات کے تحت کئی ریڈیائی فیچروں پر توصیفی اسناد اور ۸۷ء میں اوّل انعام

۳۔ یوپی اردو اکادمی کی جانب سے تصانیف پر انعامات

۴۔ تھیٹر کی خدمات پر مقامی انجمنوں کے ذریعہ اعترافات واعزازات

❋

شوکت جہاں نے غسل خانے میں کپڑے اتارے۔ کھلی پیٹھ کے پیچھے اپنا داہنا ہاتھ لے گئی۔ پیٹھ بالکل صاف اور چکنی تھی، انگلیوں سے اس جگہ پر ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی کہ کیا واقعی کسی چھپکلی نے اپنے چاروں پنجے گاڑ رکھے ہیں اور وہ مسلسل اس کی پیٹھ سے چپکی ہوئی ہے۔ وہ اپنے بھائی قدرت اللہ سے بہت بار قدرت کے اندر بیٹھے ہوئے کسی بچکانے خوف کا ذکر تو کر چکی تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک دن وہ خود اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے اپنی پیٹھ پر خوف کی ایک چھپکلی کو چپکا ہوا محسوس کرے گی۔

لیکن پیٹھ تو بالکل صاف ستھری تھی۔

پھر یہ کیا ہے جو کبھی تو لگاتار چپکا رہتا ہے اور کبھی چھوٹ کر فرش پر دور جا گرتا ہے اور اس کو لگتا ہے جیسے وہ کسی خوفناک بوجھ سے چھٹکارا پا گئی ہو۔ پنجوں کی چبھن سے اور ایک مسلسل بے چینی سے بھی چھٹکارا پا گئی ہو۔ اب وہ سیدھی لیٹ سکتی ہے، بلا خوف کروٹ بدل سکتی ہے۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ سکتی ہے کہ پیٹھ بالکل صاف ہے۔

''جلدی فیصلہ کرو شوکت جہاں''

شوکت کے کانوں میں کئی دنوں سے یہ آواز آ رہی تھی۔

عورت جانتی ہے۔

عورت اس بو کو بہت فاصلے سے سونگھ لیتی ہے۔

''جلدی فیصلہ کرو شوکت جہاں۔''

شوکت شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ پانچ منٹ تک یوں ہی کھڑی رہی۔ بدن خشک کیا، معمولی پاؤڈر چھڑکا۔ کپڑے تبدیل کرتے وقت اسے اپنے بھائی قدرت کا خیال آیا۔

''عجیب پاگل لڑکا ہے۔'' وہ بڑبڑائی ''کہتا ہے۔۔۔ ۸۰ فیصدی مسلمان تم کو یہ نہیں بتائیں

گے کہ انھیں کیا چاہیے۔" بھاڑ میں جائے۔ وہ مسکرائی۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ مجھے کیا چاہیے؟ وہ بالوں میں کنگھا کرنے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اس کے سامنے کھڑی شوکت جہاں اس سے کہہ رہی تھی۔۔۔

جلدی فیصلہ کرو شوکت جہاں۔۔۔

(۲)

قدرت اللہ ایک دن سویرے سویرے عبدل بکر قصاب کی دکان پر آدھا پاؤ بوٹیاں لینے کے انتظار میں بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ پاس ہی لکڑی کی پرانی تپائی پر کٹ چائے بھی دھری تھی۔ پہلے تو پاس پڑوس کے لوگوں کو اس بات پر بڑی حیرت رہی کہ مسلمان جو پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہو حافظ ہو، اور پابندی سے روزہ بھی رکھتا ہو، وہ ہندو فرقہ پرست پارٹی کے تنخواہ دار کی حیثیت سے مسلمانوں کے خلاف اخبارات میں زہر کیسے انڈیلتا ہے۔ عبدل نے ٹوہ لینے کے لئے قدرت کو ٹٹولا۔

"میاں آپ اب بھی اسی اخبار کا کام کر رہے ہو۔۔؟"

"ہاں۔۔"

عبدل کا خیال تھا کہ قدرت اللہ جیسے سیدھے سادے آدمی کو سیاست میں نہیں آنا چاہیے تھا اور اگر آ ہی گئے تھے تو کم سے کم ایسی پارٹی سے تو دور ہی رہنا چاہیے تھا۔ قدرت اللہ کسی سے کیا کہتے۔ قدرت اللہ خدا سے ڈرتے تھے، سماج سے ڈرتے تھے، اخبار کے مالک سے ڈرتے تھے، ادھار دال چاول دینے والے کرانہ مرچینٹ سے ڈرتے تھے۔ قاعدے سے انھیں بکر قصاب سے بھی ڈرنا چاہیے تھا۔

"ارے میاں" عبدل نے چٹکی لی "اپنے مالک سے کہئے کہ شیروانی پر پورے بٹن لگانے کے تو پیسے دے دیا کرے" قدرت اللہ نے سنی ان سنی کر دی۔ عبدل منہ پھٹ تھا بھڑاک سے بولا

"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی میاں۔"

"کیا؟" قدرت نے کہا۔

"یہ جو آپ کر رہے ہیں نا۔"

"کیا کر رہے ہیں؟" قدرت نے استفسار کیا۔

"یہی اخبار میں جو آپ کر رہے ہیں کیا اس پر آپ کو سچے دل سے ایمان ہے۔"

"یعنی؟"

"یہ کہ اللہ کو گواہ کر کے کہہ سکتے ہیں آپ کہ ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔؟"

اس پاس والے یہ سن کر دھیرے سے مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں میاں قدرت تم سے زیادہ عاقل تو یہ جاہل بکر قصاب ہے۔ پارٹی کا وہ اردو اخبار بس تھوڑا سا ہی چھپتا تھا، زیادہ تر مفت تقسیم ہوتا تھا۔ دراصل اس وقت کے حالات میں پارٹی اوپری دل سے اس کوشش میں تھی کہ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کے سامنے کبھی کبھی اپنی پوزیشن صاف کرتی رہے۔ پارٹی نے قدرت کو لائن دی کہ ایسے مسلم دانشوروں کے بیانات تلاش کر کے سامنے لائے جو مسلمانوں کو ٹکراؤ کی سیاست سے دور رکھنا چاہتے ہوں۔ اسی لئے اس نے بمبئی میں چھپنے والے ایک مضمون سے کچھ سطریں اپنے اخبار میں نقل کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ہندوستانی مسلمان کی پہچان میں یہاں کی مٹی کی بو باس بہت ضروری ہے۔ خالص اسلامی تشخص جس پر بعض علما اور سیاسی رہنما اصرار کرتے ہیں کوئی شے نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ایسے سیاسی مفادات کا ساتھ نہ دیں جو خالص اسلامی شناخت پر جارحانہ حد تک زور دیتے ہیں اور ایسی شناخت کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

جلد مسلمانوں نے اس عبارت پر یہ الزام لگایا کہ اس بیان کے چھاپنے والوں کی نیت ہی ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ ہندو فرقہ پرست اس وقت تک آرام سے نہیں سو سکتے جب تک مسلمان اپنی مذہبی اور تہذیبی پہچان کو قائم رکھے رہنے کی ضد پر اڑا رہے گا۔ پارٹی کے تھنک ٹینک نے قدرت اللہ کو طلب کیا مشورہ دیا قرآن شریف سے کچھ نکالیں۔ قدرت کے پاس اتنا وقت کہاں تھا اس نے صلح پسند علما کے جاری کئے گئے حوالے سے کام چلاتے ہوئے ایک ترجمہ پیش کر دیا۔

"ہم نے تم میں سے ہر ایک فرقے کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اس نے تم کو جو کچھ دیا ہے اس میں وہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ سو نیک کاموں میں (ایک دوسرے سے) سبقت لے جاؤ۔" یہ چھپنا تھا کہ قدرت کے دفتر میں ہی کھسر پھسر ہونے لگی۔ دوسرے دن پھر قدرت کی طلبی ہوئی تین لوگ سامنے گردن اکڑا کر بیٹھے تھے، فائرنگ شروع ہو گئی۔

"جناب آپ نماز نہ پڑھیں، روزہ نہ رکھیں، حج کو نہ جائیں، لیکن ساری زندگی نیکیاں کرتے رہیں، اور نیکیاں کرنے میں دوسرے سے سبقت بھی لے جائیں تو قیامت کے دن آپ کا کیا ہوگا، کیا آپ مسلمان گردانے جائیں گے ؟، بخشش ہوگی آپ کی ؟۔" حافظ قدرت اللہ بڑے عذاب میں پڑ گیا۔ دھیرے سے بولا "ٹھیک ہے کل سے آپ کسی کا انتظام کر لیجئے۔ میں نہیں آؤں گا۔" لیکن دوسرے دن پھر دفتر والے اسے گھر سے پکڑ لائے۔

"لیکن اس وقت آدھ پاؤ بکرے کا گوشت تلواتے ہوئے بکر قصاب کے جملے پر آس پاس کے لوگوں کی شرارت بھری مسکراہٹ سے قدرت اللہ کے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ وہ بات کو در گزر نہ کر سکا۔ دھیرے سے بولا۔

"عبدل۔۔۔ اک بات بتائے گا مجھے۔ ؟"

"پوچھو۔"

چاہا کہ وہ بات ٹال جائے لیکن قدرت کامیاب نہ ہوا۔ اس کوشش میں قدرت اللہ کا منہ لال ہو گیا۔ دل کے کسی کونے میں پتہ نہیں کب کا دبکا ہوا غصہ جاگ اٹھا۔ وہ عبدل بکر قصاب سے تھر تھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بولا۔

"میں جو پوچھنا چاہتا ہوں وہ تو صحیح صحیح بتا دے گا بھلا ؟"

"ہاں پوچھو۔" عبدل نے آواز بلند کی تو قدرت بولا۔

"جس مرد کو تیری ماں تیرا باپ بتاتی ہے، کیا تو اللہ کو گواہ کر کے کہہ سکتا ہے کہ وہی تیرا باپ ہے ؟"

"قدرت اللہ بکر قصاب کی دکان سے اتر کر دو قدم نکل چکا تھا، تب تک بکر قصاب یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ قدرت نے کوئی عام بات پوچھی ہے یا اس کی ماں کو گالی دی ہے۔ لیکن جب عبدل کو لوگوں نے سمجھا دیا تو پھر تو عبدل کی عید ہو گئی۔ اس نے قدرت اللہ پر ہی نہیں، بلکہ سارے محلے پر یہ روشن کر دیا کہ بکر قصاب کو چکوا کہنے اور انھیں ذلت کی نظر سے دیکھنے والے میاں لوگوں کے پرانے دن اب لد چکے ہیں۔ ادھڑی ہوئی شیروانی جس کے دو بٹن ٹوٹے ہوں، پہن لینے سے کوئی شریف اونچی ذات، یا اعلیٰ طبقے کا نہیں ہو جاتا۔ ایسی شیروانی تو میونسپلٹی کا چپراسی بھی پہن لے تا ہے اور کوئی بٹن ٹوٹا بھی نہیں چھوڑتا۔ عبدل نے چلا چلا کر سب کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ قدرت اللہ کے آبائی ٹھیکرے نما مکان کو مع بیوی بچوں کے کھڑے کھڑے نیلام کرا سکتا ہے۔ ٹاٹ کے

پردے کے پیچھے کھڑی قدرت اللہ کی بیوی سے اس نے بڑی بے ہودگی اور دیدہ دلیری کے ساتھ کہا۔

"اپنے زنخے میاں سے کہہ دینا۔۔ایک بال برابر بھی نہیں ہے وہ۔۔۔" آس پاس سب ہی شریف بستے تھے لیکن کسی نے عبدل سے یہ نہ کہا کہ پردہ دار عورتوں سے یوں مخاطب نہیں ہوتے۔اس دن آس پاس کے سارے سفید پوش عبدل کے اس لہجے اور جملے کو سن کر کچھ دیر کے لئے اداس رہے۔پھر ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے کا وقت آگیا جس سے بات آئی گئی ہو گئی۔شریف لوگ اپنے ٹی وی سیٹ کے بہت ممنون تھے کیونکہ جب بھی کوئی حادثہ یا واقعہ ان کی شرافت کے خون کو یکایک کھولا دیتا تو وہ چپ چاپ چھوٹے پردے کا بٹن دبا دیتے۔

بعد میں عبدل نے قریشی برادری میں بھی یہ سوال اٹھا دیا۔برادری کے چودھریوں نے معاملہ پڑھے لکھے قریشیوں تک پہنچایا تو ایک قریشی نیتا میاں عظیم قریشی بھی جو بار ہو ماس کھدر کی ٹوپی پہنتے تھے،اور ڈاکٹر محمد اقبال کے اشعار بھی صحیح صحیح پڑھ لینا جانتے تھے،اس معاملے میں پھاند پڑے۔میاں عظیم قریشی نے علامہ اقبال کے حوالے سے اپنی خودی کو اس قدر بلند کر لیا تھا کہ بڑے سے سرکاری بنگلے میں کرایہ ادا کئے بغیر برسوں سے مفت رہ رہے تھے اور خدا نے ان کی تقدیر بنانے سے پہلے ان سے اچھی طرح سے ان کی رضا بھی جان لی تھی،اس لئے مسلمانوں کو ان کے مومن ہونے میں اب کچھ بھی شک نہیں رہ گیا تھا۔وہ چیف منسٹر سے ملے اور معاملے کو سیاسی رنگ دیکر قدرت اللہ کے پیچھے پڑ گئے۔

قصابوں کا جلوس چیف منسٹر کے پھاٹک پر پہنچا۔

سب کو اندر بلایا گیا۔

"آپ کو اپنی برادری کے لئے کیا کیا چاہئے،ہمیں لکھ کر دیجئے۔ہم پورا کریں گے۔" چیف منسٹر نے گرم توے پر اپنی روٹی سینکی۔

ادھر قدرت اللہ نے اپنی پارٹی کے نیتاؤں کو خبر دی۔قدرت اللہ کی پارٹی کانگریسی سیکولرزم کو ہمیشہ گالی دیتی تھی۔اس کی پالیسی کے مطابق ایسا کوئی بھی قدم اٹھانا جس میں کسی پہلو سے بھی مسلمانوں کی بہبودی شامل ہو،دراصل مسلمانوں کو وقتی طور پر خوش کرنے والی چاپلوسی مانا جاتا تھا۔پھر قدرت کی پارٹی نے ابھی یہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے یا چھوڑ دے؟اس لئے مسلمانوں کے معاملات کو برتنے کے لئے نچلی سطح پر پارٹی کے پاس کوئی احکامات بھی

موجود نہیں تھے۔ اس سارے واقعے کو قدرت کے ذاتی معاملے سے تعبیر کیا گیا۔ اور طے کیا گیا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو پارٹی کے وقار کا مسئلہ نہ بنایا جائے۔

قدرت کی بہن کو فون پر رپورٹ ملتی ہی رہتی تھی۔ وہ پرتاپ شکلا کے پاس گئی اور عظیم قریشی کو اس معاملے سے دور رکھوانا چاہا۔ پرتاپ شکلا جانتا تھا کہ عظیم قریشی سے کچھ بھی کہنا بیکار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر ہی اندر اس حد تک دشمن تھے کہ دن کا آدھا حصہ پارٹی کے اندر ایک دوسرے کی جڑیں اکھاڑنے میں گزار دیتے، لیکن صبح ہوتے ہوتے وہ جڑیں پھر اپنی اپنی زمین پکڑ لیتیں۔ شوکت نے کئی چکر پرتاپ شکلا کے گھر کے لگائے تاکہ بکر قصاب کو نیچا دکھایا جاسکے، مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ آخر کو وہ الٹا بھائی پر ہی برس پڑی۔

"تم سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کی پارٹی میں گھس کر تم اپنی عزت بچالو گے؟ ایک معمولی چکوا تمہارے گھر پر گالیاں بک کر چلا گیا اور تمہاری پارٹی والے کچھ نہ کر سکے۔"

"کون لے گیا ہے مجھے ہندو پارٹی میں جانتی ہو۔؟" قدرت نے سوال کیا۔

"تمہارا خوف لے گیا ہے۔" شوکت پٹاخ سے بولی۔

"خوف گالی نہیں ہے شوکت۔" قدرت اللہ کچھ سنجیدہ ہو گیا۔ "خوف ہمیں ایک جہت بھی دیتا ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"میری مانو تو خوف کو اتنا بڑھاوا ملنا ضروری ہے کہ وہ ایک قوت بن جائے،" شوکت بھائی کے سامنے خاموش بیٹھی ایک انجان سی الجھن میں اپنے پیر ہلاتی رہی اسے خیال آیا۔ پرتاپ شکلا نے کہا تھا۔

"سماجی شریف زادہ اپنے خوف کو اپنی مدافعت کے لئے استعمال کرتا ہے اور سیاسی حرام زادہ اپنے خوف کو جارحیت کے ہتھیار کے طور پر۔"

شوکت کو پرتاپ شکلا کی یہ بات شائد یاد بھی نہ آتی اگر قدرت اللہ کو اپنی ادھڑی ہوئی شیروانی پہن کر قریشی برادری کے سامنے نہ جانا پڑتا اور عبدل بکر قصاب سے معافی نہ مانگنا پڑتی۔ شوکت کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ لیکن قدرت معافی مانگ کر اپنے کہنے کے مطابق خوش تھا۔ شوکت جانتی تھی کہ اس کا بھائی باپ کی پارٹی کی مخالف پارٹی میں کیوں گیا تھا؟ صرف اس لئے کہ باپ نے اسے پڑے پڑے کھانے کا طعنہ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ قدرت بکر قصاب سے معافی مانگ

سکتا ہے، لیکن باپ کے بستر مرگ پر بھی وہ اس سے ملنے نہیں جا سکتا۔ وہ کہتا تھا اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ شوکت نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ بھائی نے سجدوں سے سر اٹھانے میں دیر کرنا شروع کر دی تھی۔ تب شاید وہ رویا بھی کرتا تھا۔

(۳)

"گرمی بہت تھی۔ دوپہر کو ویران کر دینے والے جھکڑ باہر چل رہے تھے۔ شوکت جہاں کچی دیواروں والے ٹھنڈے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی اس نیند میں اس نے خواب دیکھا۔ اس کا بوڑھا مرحوم باپ کھدر کا کرتا پہنے کسی شامیانے کے نیچے دریاں بچھوا رہا ہے، کوئی کانگریسی نیتا تھوڑی دیر میں تقریر کرنے آنے والا ہے، بڈھے کو فخر تھا کہ اس نے لال بہادر شاستری جی سے کئی بار ہاتھ ملایا تھا اور اسے خوشی تھی کہ ہیلی کاپٹر پر بیٹھتے وقت اس نے گرم پانی کی بوتل اندرا جی کی پیٹھ کے پیچھے رکھی تھی کیونکہ ان دنوں وہ دن رات دورے کر رہی تھیں جس سے ان کی پیٹھ درد کرنے لگی تھی۔ پھر شوکت نے اسی خواب میں دیکھا کہ اس کے والد منھ لٹکائے گھر کے اندر گھس رہے ہیں۔ چہرے پر مایوسی ہے۔ وہ انگنائی میں آکر کھڑے ہوئے ہی تھے اور اپنی سانسیں برابر کر ہی رہے تھے کہ شوکت کی والدہ نے ان پر سوال داغ دیا۔

"کہاں گئے تھے؟"

"کیا بتاؤں کہاں گیا تھا۔ آج چوتھا روز ہے برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے، منتری جی کا انتظار کرتے کرتے۔"

"کیا کہتے ہیں۔ کیا ملتے بھی نہیں۔؟" بیوی نے ٹھوکا دیا۔

"ملے تھے"

"تو تم نے کیا کہا۔۔۔؟ گھگھی کرنے لگے ہو گے۔ وقت پر منھ سے بول تو پھوٹتا نہیں تمہارے۔"

"کہہ تو چکا ہوں کہ قدرت اللہ کے لئے سستے غلے کی دکان کا پرمٹ دلوا دیجئے۔ مہربانی ہو گی آپ کی۔"

"تو۔۔۔؟"

"تو کیا۔۔۔ کل آنا، پرسوں آنا۔ آج چوتھا چکر تھا۔"

"شوکت جہاں کے والد مرتے مر گئے، اور کانگریس پارٹی کے جلسوں کی دریاں بچھانا نہ چھوڑیں، لیکن قدرت اللہ کو سرکاری غلے کی دکان کا پرمٹ نہ دلوا پائے۔ اور بیٹا یہ سوچتا ہی رہ گیا کہ بلیک میں شکر کی بوریاں بیچ کر وہ بھی اپنے دن پھیر لے گا۔ باپ نے روٹیاں توڑنے کا طعنہ دیا تو قدرت اللہ ہندو فرقہ پرستوں کا اخبار سنبھالنے چلا گیا۔ قدرت کے والد کے لئے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ تب سے بیٹے کا منہ نہ دیکھا۔

"فون کی گھنٹی بجی تو شوکت جہاں کی نیند کھل گئی، خواب بھی بکھر گیا۔

"فون پر دوسری طرف ویدھائک پرتاپ شکلا کی آواز تھی۔

"میں تم سے شادی کرنے کے لئے چاہوں تو آج ہی مسلمان ہو سکتا ہوں۔"

"اچھا۔۔"

"ہاں اخباروں میں تصویر چھپوا کر اعلان کر سکتا ہوں کہ پرتاپ جی مشرف بہ اسلام ہو گئے"

"کیا واقعی؟"

"بالکل! پھر تم کو اپنی منکوحہ بیوی بنا کر کسی شریف زادے کی طرح تمہارے کھوٹے سے بندھا بھی رہ سکتا ہوں۔ پر میں یہ آسان کام نہیں کروں گا۔"

"اس دن شوکت جہاں پر ہنسی ہنسی میں یہ راز کھلا کہ ودھایک پرتاپ شکلا بھی گڑ تو کھانا چاہتے ہیں مگر گلگلوں سے پرہیز بھی ہے۔ کیونکہ پرتاپ شکلا نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ شوکت جہاں کی تھوڑی سی بالائی کھا کر ساری زندگی اس کی کھوجڑ کو نگلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

"ایسی صورت میں، میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" شوکت جہاں نے شرارت کے ساتھ اپنی ہنسی روکتے ہوئے پرتاپ شکلا کو چھیڑا تھا۔ ادھر سے آواز آئی۔

"تم نے کشتی لڑنے والے پہلوانوں کو دیکھا ہے کبھی؟"

"دیکھا تو ہے۔"

"ان کے جسم پر لباس کیوں نہیں ہوتا جانتی ہو۔۔۔؟"

"بتائیے۔" وہ بولی۔

"لباس داؤں پیچ لگانے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔"

"تو۔۔۔؟"

"مگر ہم ایسے پہلوان ہیں کہ جتنے زیادہ کپڑے پہنیں گے اتنے ہی زیادہ خطرناک داؤں پیچ استعمال کریں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ جانتی ہو؟"

"آپ ہی بتائیے۔" وہ بولی۔

"اس لئے کہ ہم بدن سے نہیں، اپنی خباثت سے لڑتے ہیں۔ ہماری خباثت جتنی زیادہ پردوں میں رہے گی اتنی ہی گھاتک ہوتی جائے گی۔

"مگر آپ نے قدرت بھائی کو جو کیسٹ سنوانے کے لئے دیا ہے اس میں کوئی بھی بات ڈھکی چھپی نہیں سب کچھ کھول کر کہا گیا ہے۔"

"کونسا کیسٹ۔۔؟" پرتاپ شکلا چونکا۔ اچھا وہ والے کیسٹ! ہاں تمہارا بھائی جن زہریلے لوگوں کی روٹی کھا رہا ہے اسے سناؤ اور بتاؤ کہ یہ کرتوت ہیں ان زنخوں کے۔"

"آپ ہی کوئی ٹھیک ٹھاک نوکری دلوا دیجئے قدرت کو وہ وہاں سے چلا آئے گا۔"

پرتاپ نے بات ٹال دی، بولا۔ "کیسٹ ویسٹ میں نے تو سنے نہیں، کیا تم نے سنے؟"

"جی ہاں" شوکت بولی۔ "کچھ باتیں زبانی یاد بھی کر لی ہیں"

"جیسے؟"

"جیسے

بھارت میں بابر بہت ہیں

ان کو ختم کرنے کا انتظام کر دیجئے

بسنے نہ پائیں رام ودروہیوں کی بستیاں

ایسی بستیوں کو شمشان کر دیجئے۔"

ودھایک پرتاپ، گوری چٹی، جگر مگر آنکھوں اور بانکی چتونوں والی چھریری شوکت جہاں کو جس کی مسکراہٹوں میں بجلیاں پسی تھیں، بہت دنوں سے یہ سمجھا رہا تھا کہ شوکت یہ نہ دیکھے کہ کانگریس ہی نہیں بلکہ کوئی بھی پارٹی کیا کر رہی ہے، اور مسلمانوں کو اس سے کیا توقعات تھیں اور وہ توقعات کتنی پوری ہو رہی ہیں اور کتنی نہیں؟ اور وہ کتنی سیکولر ہے اور کتنی فرقہ پرست؟ اور ملک کے مسائل کیا ہیں اور انھیں سلجھانے کے سلسلے میں کون کتنا ایماندار ہے اور کون کتنی قربانی دے رہا

ہے ؟اور کتنا سچا اور کتنا جھوٹا ہے ؟ایسی باتوں سے وہ کوئی مطلب نہ رکھے اور اوپر اوپر سے بس پارٹی کی کاریہ کرتا نی رہے اور ہر گھڑی اس موقعے کو استعمال کرے جو اسے دنیا بھر کے اصولی پچڑوں میں ڈالے بغیر اس کے سکھ سادھن فراہم کرنے میں مدد کر سکیں۔ کیونکہ جب تک وہ پارٹیوں کا تنتر سمجھے گی، عیش کرنے کی عمر نکل جائے گی۔ ایک بار وہ فون پر پھر یہی بولا۔

"تم مجھ سے پوچھتی ہو کہ تم میرے لئے کیا کر سکتی ہو۔۔۔ ؟ تو میں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ پہلے تم کچھ اپنے لئے کرو۔ کیونکہ سب اپنے اپنے لئے ہی کر رہے ہیں۔ میں خود بھی اپنے ہی لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے سے فرصت نہیں پاتا۔ اس لئے تم اپنے لئے فی الحال اتنا کرو کہ خوب بہت سے کپڑے پہن کر اپنی خباثت کو دھار دیتی رہو، کیونکہ زنانوں اور زنخوں کی بھیڑ میں ہو۔ یہ زنخے تمھیں ننگا تو کر دیں گے لیکن تمھاری اس نروستر تا کا سوا بھاوک سکھ نہ بھوگ پانے پر الٹا تمھیں ہی سنگ سار بھی کر ڈالیں گے۔" پرتاپ اپنی بات کر رہا تھا اور شوکت کان پر فون کا رسیور لگائے جانے کہاں پہونچ گئی تھی۔

کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے وقت! ہائے اللہ۔ کیا میں وہی لڑکی ہوں۔ چودہ یا مشکل سے پندرہ برس کی لڑکی جو باپ کی گردن میں باہیں ڈالے اس کے منہ سے امام حسین کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وصیت کے ارشادات سنا کرتی تھی۔

" فرزند! دنیا دار تو بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں جو ایک دوسرے پر غراتے ہیں، طاقتور کمزور کو کھاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بندھے ہوئے اونٹ ہیں جو نقصان نہیں کر پاتے، کچھ چھٹے ہوئے اونٹ ہیں جو ہر طرح کا نقصان کرتے پھرتے ہیں۔ نہ انکا کوئی گلے بان ہے اور نہ رکھوالا۔"

کیا میں وہی لڑکی ہوں۔

سر پر دوپٹہ، نظریں جھکی ہوئی، دل کے اندر عقیدت کی نرم پھواروں کا فوارہ سا چھوٹتا ہوا جب کہ میری عمر کی دوسری لڑکیاں کسی عورت کے بے ہنگم منہ پر نظر پڑ جائے تو اپنی ہنسی نہ روک پاتی تھیں۔

یا نبی سلام علیکا

یا حبیب سلام علیکا

پڑوس والی عورت باقی تمام عورتوں سے الگ، لفظ "سلام" کو کس طرح ادا کرتی تھی،

جیسے کسی تکلیف میں ہو، اسے دیکھ کر سب ہی لڑکیاں ہنس دیتی تھیں۔ پوری محفل میں اس بے ادبی پر بعد میں سب کی خبر لی جاتی تھی لیکن شوکت پورا اسلام بڑی تمکنت سے پڑھتی۔

باپ کے مردان خانے میں وہ میلاد کا حصہ لے کر چند مہمانوں کو تقسیم کرنے کے لئے پہونچی تو پہلی بار اس نے پرتاپ شکلا کو دیکھا تھا۔ لڈو کا پیکٹ اس نے پرتاپ کو بھی دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی پرتاپ کی آنکھیں چمک سی گئیں تھیں۔

"بیٹی ہے میری۔ شوکت جہاں۔۔" باپ نے پرتاپ کو بتایا تھا۔ پرتاپ نے لڈو ہاتھ میں لے کر دوسرے ہاتھ کو شوکت کی کمر کے پیچھے لاکر تھوڑا اپنی طرف کھینچا اور پھر شوکت کے ماتھے کو چوم کر اس کے ایک گال کو تھوڑا سا تھپتھپایا۔ تب وہ تیس برس سے زیادہ کا نہ تھا۔ گورا رنگ، خوبصورت آنکھیں، ہلکے گھنگھر والے بال کھدر کے کرتے میں گریباں کے اندر چھاتی پر گھنے کالے بالوں کے گچھے۔ میں جھوٹ کیوں بولوں میں نے سوچا تھا، میرا دولہا اسی رنگ روپ اور کاٹھی کا اتنا ہی لمبا ایسے ہی مسکرانے والا ہونا چاہئے۔ وہیں پہلی بار میں نے ابا کے دوست شہباز خاں صاحب کی بیوی کو بھی اتنے مردوں کے بیچ پورے اعتماد سے بحث کرتے ہوئے سنا تھا۔ میرے اللہ کتنی معلومات تھی اس عورت کو! لوگ انھیں عا ٔشہ بہن کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ کیا پیشانی تھی ان کی اور کیا کٹورا ایسی شاداب، جگاتی اور جاگتی ہوئی آنکھیں تھیں اور ان کی وہ ریشمی سی نظریں، میں تو حصہ تقسیم کرکے کمرے میں رکتی ہی نہیں، لیکن ان کی زندگی سے بھرپور اور کھنکتی ہوئی آواز نے مجھے روک لیا۔ وہ بات کوئی بہت اونچی ہی کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں۔

ہر ۲۵ منٹ پر ایک بڑے جرم کا ارتکاب۔

ہر ۲۴ گھنٹے میں تین قتل، پانچ زنا بالجبر اور تین ہزار چھوٹی چوریاں۔

یہ ہے ہماری دنیا کا مہذب ملک، امریکہ!"

"زنا بالجبر کسے کہتے ہیں" میں نے سوچا تھا ابا سے پوچھوں گی۔ ہائے اسی وقت میری بد قسمتی کہیں مجھ پر ہنس رہی تھی، لیکن اب تو زندگی کے تیس سال گزار کر وہ ٹیلیفون پر پرتاپ شکلا سے مخاطب ہے۔ وہ غصے میں پرتاپ سے بولی "مجھے ننگا کئے جانے کی تمھیں بہت فکر ہے نا!"

"ہاں" وہ بولا۔ اسی لمحے شوکت نے پرتاپ کو موٹی سی گالی دی۔ کھلی آواز میں ماں کی گالی۔ جس پر پرتاپ نے قہقہہ لگا کر اسے بتایا کہ اس کو مزہ آگیا۔ پھر دونوں نے فون رکھ دیا۔

شہری کاریہ کرتاؤں کی سطح پر پارٹی، میٹنگ میں جب وہ شوکت جہاں سے ملا تو اس نے

جہاں شوکت کو اس پہلو سے آگاہ کیا کہ راج نیتی میں آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت اپنے کو طرم خاں سمجھنے لگے، وہیں اس نے شوکت جہاں کی یہ تعریف بھی کی کہ فون پر اس نے پرتاپ کو جس قدر نربھے ہو کر اور نسنکوچ طریقے سے پورا منہ کھول کر شرمائے بغیر شبدوں کو مضبوطی سے ادا کرتے ہوئے ماں کی جو گالی دی تھی، اسے سن کر پرتاپ کو پوری امید ہو چلی ہے کہ جس راہ پر وہ شوکت جہاں کو لگانا چاہتا ہے، شوکت بڑے آرام سے اس راستے پر لگ جانے کے پورے جراثیم اپنے اندر رکھتی ہے۔ پرتاپ جب ادھر ادھر دوسرے لوگوں میں الجھ گیا تو شوکت ایک کونے میں زمین پر بچھے سفید فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کی اس مہلت میں آخر اس نے خود سے پھر سوال کیا۔

"کیا میں وہی لڑکی ہوں۔۔؟"

اور اسے اپنی زندگی کے انیسویں سال کی وہ دوپہر یاد آئی جب وہ گھر کے سونے بر آمدے میں چارپائی پر ہاتھ کہیں اور پیر کہیں ڈالے بے خبر سو رہی تھی۔ پسینے سے ململ کا باریک کرتا اس کے سینے سے چپک گیا تھا اور اوپر کے ہونٹ کی لکیر اور ناک کے درمیان جوان گلابی جلد پر ہلکے ہلکے سنہرے روئیں پسینے کی بوندوں سے تر تھے، اور اس کی شلوار کے چڑھے ہوئے ایک پائنچے سے اس کی سڈول اور دھکتی سی پنڈلی کھلی ہوئی تھی۔ اچانک اس کے سینے پر کاغذ کی گولی سی آکر گری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے دیوار کے روشندان سے جو پڑوسی کے گھر کے لئے بھی مشترک تھا دو آنکھیں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔

"ہائے اللہ" وہ گھبرا کر اٹھی، ادھر ادھر دیکھا۔ روشندان سے آنکھیں جلدی سے ہٹ گئیں۔ شوکت نے کاغذ کی وہ گولی سنبھالی، لوٹا اٹھا کر بغیر فلش والے پاخانے میں گھسی۔ کاغذ پر عشقیہ عبارت تھی، اس کے بالوں کو ہیما مالنی کے بالوں سے زیادہ خوبصورت بتایا گیا تھا۔ اس کا دل دیر تک دھڑ دھڑ کرتا رہا۔ وہ اسی شام بھاگی ہوئی اپنی سہیلی مشتری کے پاس گئی۔ مشتری لڑکے سے خوب واقف تھی بجازے میں کپڑے کی دکان تھی اس کی۔ پھر ایک اور سہیلی رقیہ راز دار بنی۔ وہ دونوں شوکت کو گھیر کر بجازے لے گئیں، دیکھا ایک دکان پر وہی دو آنکھیں تھیں۔ شوکت گھبرا کر مشتری سے بولی۔

"ہائے اللہ اشفاق بیٹھا ہے۔" اشفاق نے ان سب کو دیکھا، دکان کے اندر بلایا، جیسے سب پہلے سے ہی طے تھا۔ ٹھنڈی بوتلیں منگائیں، پھر آئے دن بجازے کے کام نکالے جانے لگے۔

آئیس کریم، چاٹ، گلاب جامنیں، پھر تینوں دوپہر بارہ بجے والے شو میں بھی پہونچنے لگے۔ اشفاق کے پاس والی سیٹ پر شوکت کو بیٹھایا جاتا۔ اندھیرا ہوتے ہی اشفاق کی انگلیاں شوکت کی بائیں چھاتی کے پاس سرسراتیں۔ شوکت مزاحمت کرتی مگر اشفاق اور ڈھیٹ ہو جاتا تو شوکت یکایک رقیہ سے اپنی سیٹ بدل لیتی۔ وہ بھلا کہاں جانتی تھی کہ بس چند ہی روز بعد وہ زندگی کے سب سے بھیانک تجربے سے گزرنے والی ہے۔ جہاں لفظ ختم ہو جاتے ہیں اور بیان بے صدا ہو جاتے ہیں۔

شوکت کے کانوں میں پرتاپ کی آواز آئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"جی۔۔۔" وہ ایک دم سے اچھل پڑی۔ اور اسے یاد آیا کہ وہ کہیں اور نہیں پارٹی میٹنگ میں ہے، اور اس کے سر پر تاپ شکلا کھڑے ہیں۔ اس نے پھر شوکت سے سوال کیا۔

"کس سوچ میں ڈوبی تھیں؟"

"کچھ نہیں" شوکت دھیرے سے بولی۔ جلسہ گاہ خالی ہو چکی تھی، دو چار کام کرنے والے ہی رہ گئے تھے۔

"ہم دونوں کو ملتے ہوئے چار برس تو ہو گئے ہوں گے۔ ہے نا۔۔؟" پرتاپ نے جاننا چاہا۔

"مجھے یاد نہیں۔' شوکت بولی۔

"اس دن فون پر جو آواز تم نے مجھے گالی دینے میں نکالی تھی اتنے دنوں میں کبھی نہیں نکالی۔"

"توبہ ہے۔" شوکت تیوری چڑھا کر بولی "آپ کو آواز بھی یاد ہے،"

"یاد ہے۔ بہت دنوں تک یاد رہے گی۔"

"چھوڑیئے۔" یہ کہہ کر شوکت فرش سے اٹھی، وہ وہاں سے ٹلنا چاہتی تھی۔

"سنو" پرتاپ نے اسے روکا تو وہ اس کی آنکھوں کو پڑھنے لگی۔

"ہمیں سب پتہ ہے"

"کیا؟"

"تم کہاں جاتی ہو، کس سے ملتی ہو۔ اور کتنی دیر ملتی ہو۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" شوکت کی بھویں چڑھ گئیں۔

"یہ بھی پتہ ہے کہ اتنی مضبوط جمی ہوئی، خوب ٹھکی ہوئی، وزن دار آواز تمھیں کہاں سے مل رہی ہے۔"

"اب چلونگی" شوکت نے کہااور اس سے پہلے پرتاپ کچھ اور کہتا شوکت شامیانے سے باہر جاچکی تھی۔

(۴)

"تو یہ میری ٹوہ میں لگا رہتا ہے" شوکت اپنا بلاوز پریس کرتے کرتے بڑبڑائی۔ ہر دم دیکھتا رہتا ہے کہ میں کتنی اس کے انگوٹھے کے نیچے ہوں اور کتنی باہر۔ ایک دو سنٹی میٹر بھی ادھر ادھر کھسکی تو بھڑکنے لگتا ہے۔ ایسے جیسے میرا خصم ہو یا میں اس کی رکھیل ہوں! جب دیکھو جھوٹی سچی کہانیاں گڑھ کر میرا دل لیتا رہتا ہے۔ فلاں منتری تمھیں کیسے گھور رہا تھا۔ فلاں نیتا کی رال ٹپک رہی تھی تمھیں دیکھ کر۔ کئی بار ایسی باتیں کی ہیں اس نے جیسے وہ دھایک نہیں، تیسرے درجے کا پھوہڑ اور گھناؤنا دلال ہو۔۔ بہت چالاک ہے۔ شوکت نے بجلی کی استری بند کرتے ہوئے سوچا۔ "عبدل بکر قصاب کے معاملے میں سب کی قلعی کھل گئی۔ میری اور میرے بھائی کی کسے پرواہے۔ بکر قصاب برادری کے ووٹ انھیں زیادہ پیارے ہیں۔ اتنا سا بھی کام کرتا ہے تو کسی نہ کسی بہانے اپنے فارم ہاؤس پے لے جاتا ہے اور وہاں اپنا ندیدہ پن دکھاتا ہے۔ بے مردوالی عورت کی چھچھالیدر یونہی ہوتی ہے کیا! عائشہ باجی نے کہا تھا کہ میں ان کی انجمن میں کچھ کام کروں۔ ہائے کیسی غلطی کی میں نے۔ شہباز صاحب نے کل صبح بلایا ہے کوٹھی پر۔ کچھ بھی ہو جائے عبدل کو جوتے ضرور کھلوانا ہیں۔ ملوں گی شہباز صاحب سے۔

صبح شوکت کوٹھی گئی

کوٹھی جس کے صدر دروازے پر ھذا من فضل ربّی کندہ تھا۔

کوٹھی، جس کے اندر زبانیں باہر نکالے، ہانپتے، خونخوار، اصیل نسل کے دو کتے تھے۔

قد آدم شیشے تھے، ہوادار اور روشن گیلریوں میں پیتل کے چمچماتے بھاری بھرکم گملوں میں پام کے وارنش کئے پتوں والے سبز اور شاداب پودے تھے۔ سرسراتے ہوئے خوابناک پردے تھے۔ بینڈ باجے کے ساتھ لان میں دی جانے والی پر تکلف پارٹیاں تھیں۔ حکام کی ریل پیل تھی، موٹریں اور گاڑیاں تھیں، رونق اور چہل پہل تھی۔ اور ان سب کے بیچ پچاس کے لپیٹے میں مضبوط ہاتھ پیروں اور اونچی پیشانی والا سرخ وسفید ہنس مکھ سنجیدہ اور نرم گفتار سا کسی قدر اداس اور تنہا تنہا سا شہباز خاں تھا جس کے اسٹیڈی روم میں عائشہ کی قد آدم ایک تصویر تھی۔ ہر طرف چلتے پھرتے نوکر چاکر تھے۔ ایک وفادار موروثی خانساماں تھا، جو اپنی مرحوم مالکن کو یاد کر کے باورچی خانے کے کونے میں اکثر آنسو بہایا کرتا تھا۔ کوٹھی کی دیکھ ریکھ کرنے والے اور ٹیلیفون پر مالک کے لئے پیغامات وصولنے والے گنجی چاند والے اور کرتے کے نیچے پستول لٹکائے رہنے والے نجو میاں تھے جن کے ساتھ خانساماں مالک کی غیر موجودگی میں پہاڑ جیسے خالی خالی اور بھائیں بھائیں کرتے ہوئے دونوں میں حقہ گڑگڑایا کرتا تھا۔ اس کے مالک کے جوتوں کے کارخانے میں دوبار آگ لگ چکی تھی۔ اس میں کام کرنے والے کاریگروں کے دروازوں پر کئی بار انجان لوگ کھڑیا سے کتو کا نشان لگا چکے تھے، لیکن خدا اس کے مالک کو دن دونا رات چوگنا نواز رہا تھا۔۔۔ مالک کوٹھی میں ہوتے تو کچن مغلئی کھانوں، روسی سلادوں اور چینی ڈشوں کی گرم اور اشتہا انگیز بھاپوں سے بھرا رہتا۔ اسے دم مارنے کی فرصت نہ ملتی۔

شوکت جب کوٹھی میں عا،شہ کی تصویر کے پاس پہونچی تو اس کے قدم رک گئے۔ اس کے کانوں میں اس کی منہ بولی عائشہ باجی کی وہ کھنکتی آواز اور آنکھوں میں سراپا ایک بار پھر ابھر آیا جس سراپے کو اس نے پہلی بار اپنے ہی گھر پر میلاد کے لڈو تقسیم کرتے ہوئے دیکھا تھا اور جس آواز کو اس نے بڑی شان سے بحث کرتے سنا تھا۔ شوکت کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو آگئے۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"عائشہ باجی۔۔۔ آپ وقت سے اتنا پہلے کیوں چلی گئیں؟"

"آپ نہیں جانتیں باپ کے مرنے کا اتنا غم نہیں ہے مجھے، ماں کی آوارگی نے بھی مجھے نہیں توڑا، بھائی کی کھوکھلی انا کا بھی مجھے شکوہ نہیں۔۔۔ مجھے تو شکوہ آپ سے ہے۔ آپ نے کہا تھا۔۔۔ میں تجھے کچھ بنا کر رہوں گی۔" شہباز کے ڈرائنگ روم میں جہاں اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے کسی کیسٹ کے بجنے کی آواز آرہی تھی۔

کہیں نہ پھر ہم سے چھن جائے

رام جنم بھومی ہماری

اٹھو چنوتی کو سویکارو

یو دھ کوں آج ہماری باری

مٹا ڈالو سے ان دشمنوں کو

بنو جگت کے وشو وجیتا

جب شوکت ڈرائنگ روم میں پہونچی تو ٹیپ ریکارڈر بند ہو چکا تھا اور ایک صاحب جو اپنے اندرونی جذبات سے خاصے مغلوب تھے، بولنے کے لئے پر تول چکے تھے۔

"شہباز صاحب۔۔۔ کل ملا کر جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔۔ نمبر ایک۔۔" یہ کہہ کر انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے جذبات سے مغلوب ہو کر پہلے سگریٹ جلائی، پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے

"ہر ہندو کو یقین دلایا جارہا ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلم برادری ہوگی وہاں یقینی طور پر اسلام کے نام پر یہ برادری دیگر فرقوں سے علاحدگی پسندی کا راگ ضرور الاپے گی۔" اس علاحدگی پسندی کی مثالیں دینے کے لئے وہ صاحب آذر بائیجان، مشرقی یورپ، برطانیہ اور برما وغیرہ کے ہنگاموں اور قتل وغارت گری کے حادثوں کے بخیے ادھیڑنے لگے اور وہاں کے مسلمانوں کو علاحدگی پسند ثابت کرنے میں لگ گئے۔

"بالکل درست" دوسرے صاحب کو بھی جلدی تھی۔ وہ بار بار آنکھیں میچ رہے تھے۔ لگ رہا تھا وہ کچھ ایسے تناؤ سے گذر رہے ہیں کہ بولیں گے تو الفاظ ان کے خیالات کا ساتھ دینے میں اس قدر کم پڑ جائیں گے کہ انہیں ایک جملہ بول کر ہی چپ ہو جانا پڑے گا۔ مگر انہوں نے غالباً ایک اچھا کام کیا کہ اپنے خیالات بہت چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا کرنا شروع کئے۔ وہ بات کرنے میں جلدی جلدی آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے اور آواز کی کپکپاہٹ پر قابو بھی پانا چاہ رہے تھے۔

وہ بولے "ہمارے بارے میں سب کو یقین دلایا جا چکا ہے کہ ہر مسلمان تعصبی ہے۔ ہر مسلمان جارح ہے۔ ہر مسلمان دل سے پاکستانی ہے۔"

پھر انہوں نے بتایا کہ چند مضامین انہوں نے ایسے بھی پڑھے ہیں جن میں نئی ہندو نسل کو یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا کام چپکے چپکے ہتھیار جمع کرنا ہے اور بوسیدہ مکانوں کی چھتوں کے نیچے بم بنانا ہے۔ اس وقت پہلے والے صاحب نے دوسرے کی بات کاٹی اور بولے "مسلمان مغربی اخباروں

کے ذریعے بدنام کئے گئے صدام حسین کی طرح بلا تفریق بد خصلت اور خطرناک ہے، اس لئے اس مسلمان کا یا تو صفایا کر دینا چاہئے یا پھر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دینا چاہئے۔ اس لئے اسے راہ راست پر لانے کے لئے عام ہندو کو انگریزی کے تین لفظ بار بار یاد کرائے جا رہے ہیں۔۔۔

CONVERSION REDUCTION SUBMISSION

شہباز خاں بولنے کو تھا، اس لئے سب کو یوں دیکھ رہا جیسے ان سے معافی مانگنے جا رہا ہو۔ وہ اکثر کوئی بات شروع کرنے سے پہلے ایسا احساس ندامت، محسوس کرتا تھا جیسے جو کچھ وہ کہنے جا رہا ہے اس سے کہیں دوسرے کا دل تو نہیں دکھے گا۔ وہ نرمی سے بولا۔

"ملک کی تقسیم کے وقت پنجاب میں کیا ہوا تھا؟ تقریباً سات ہزار مسجدیں مسمار کی گئیں۔ پھر بھلا ایک مسجد سے دست بردار ہو جانے میں کیا قیامت آجائے گی؟ اس بہانے اپنی لیڈری چمکانا ہے تو بات دوسری ہے۔" اس کے بعد شہباز خاں موضوع کو کچھ دیر کے لئے بدلنے کا موقع نکالتے ہوئے قریب ہی بیٹھی شوکت جہاں کی طرف پلٹے، دھیرے سے مسکرائے اور بولے۔

"تم نے فون پر مجھے جو کچھ بتایا تھا اسے سمجھنے کے لئے دراصل میں نے تم سے کہا تھا کہ کسی وقت صبح یہاں آجاؤ۔" شوکت کا جیسے بٹن دب گیا اور وہ ریکارڈ کی طرح بجتی ہی چلی گئی۔

"اس کے پچاس جوتے لگوانا ہیں وہ بھی کھلے عام۔ دو ٹکے کا چکوا اور اس کی یہ ہمت۔۔۔ میرا بھائی حافظ قرآن ہے۔ اپنی سانس سے بھی کسی کو چوٹ نہیں پہونچاتا۔ میری بھابھی پانچ وقت کی نمازی، کبھی کسی سے اونچی آواز میں بھی نہیں بولی۔ اس پردہ دار خاتون کو سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں سنائیں اس کے شوہر کو زنخا بتایا۔ نیتاؤں نے اس کی برادری کا ساتھ دیا اور میرے بھائی کو ایک جاہل اور بدقومے سے معافی مانگنا پڑی۔ اس کی یہ ہمت! یہ حوصلہ! میرے والد صاحب سے اکثر موٹی موٹی رقمیں مانگ لے جایا کرتا تھا، میاں تھوک میں بکرے لینا ہیں اور باہر کے سوداگر ایک پیسہ ادھار نہیں رکھتے۔ ہماری ڈیوڑھی کو جھک کر سلام کرنے والا اسی ڈیوڑھی کی بہو کے سامنے گالیاں بکنے کے بعد الٹا میرے بھائی سے معافی منگواتا ہے۔۔۔"

شہباز خاں دو پل خاموش رہے۔ گویا انتظار کر رہے تھے کہ شوکت جہاں کچھ بولے۔ پھر لہجے میں مٹھاس گھولتے ہوئے بولے۔

"کہہ چکیں؟"

"جی۔" شوکت نے جواب دیا۔

"غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا؟"

"جی نہیں۔"

"تو ٹھنڈا کرو۔۔ پچاس تک گنتی گنو۔ میں بھی گنتا ہوں۔ پھر بات کروں گا۔" یہ کہہ کر شہباز خاں خاموش ہو گئے گویا دل ہی دل میں شوکت جہاں کے لئے پچاس تک کی گنتی گن رہے ہوں۔ سامنے کے صوفے پر ممو خاں صاحب بیٹھے تھے۔ ممو خاں شوکت کے والد سے خوب واقف تھے کہ مرحوم بے چارے نیتاؤں اور حکام کے لئے آموں کی ڈالیاں فصل پر ممو خاں کے باغوں سے منگواتے تھے اور کھچڑے اور پائے کی بڑے اہتمام کے ساتھ دی گئی دعوتوں میں ممو خاں صاحب کو خاص طور پر بلاوادے کر آتے اور اس وقت تک دستر خوان پر نہیں بیٹھتے تھے جب تک ممو خاں صاحب تشریف نہیں لے آتے۔ کہا جاتا تھا کہ ممو خاں جس محفل میں بھی ہوتے وہ محفل گل و گلزار ہو جایا کرتی۔ شہباز خاں کی پچاس تک کی گنتی پوری ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ سے بولے۔

"تم جو کچھ ہو وہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہاں! جو کچھ تم نہیں ہو وہ بتائے دیتا ہوں۔"

"ایسا کیوں؟ جو کچھ ہوں وہ بھی بتائیے۔۔" شوکت شرارت سے بولی، غالباً پچاس تک گن کر وہ اپنی جھنجھلاہٹ سے باہر آچکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ زور سے ہنسے۔ دوسرے سب بھی مسکرا دئے۔ "تم خوبصورت ہو۔۔' وہ بولے "جوان ہو اور کچھ کچھ ذہین بھی ہو مگر۔۔

"مگر۔۔؟" شوکت نے لفظ دہرایا۔

"تم آج کی نہیں ہو۔۔ یعنی عصری تقاضوں کے مطابق جی نہیں پا رہی ہو۔

"مطلب۔۔۔؟"

"مطلب جو تم کو ابھی ہونا چاہئے، وہ تم نہیں ہو۔"

"کیوں۔۔۔؟" ممو خاں تیوری چڑھا کر بیچ میں بول پڑا۔

"کیوں کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔" شہباز اداسی سے بولے۔ "یہ پورے گروہ کا معاملہ ہے۔" شہباز نے ایک بار ہمت کی کہ وہ ان لوگوں کو بتائے کہ مسلمان کمبخت اپنے پرانے تاریخی اور طبقاتی شعور سے آگے نہیں نکل پا رہا۔ غالباً اس کے لیڈر اسے ایسا نہیں کرنے دے رہے۔ وہ ملک کے لئے ASSET بننے کے واسطے چھٹپٹا تو رہا ہے لیکن اس کے خود غرض مسیحا ہی پیچھے سے اس کی

ٹانگ پکڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں جان پا رہا کہ وہ اپنے وجود کو اپنے عہد کے لئے مفید کیسے بنائے؟ لیکن شہباز ایک ٹھنڈی سانس ہی بھر کر رہ گیا۔ ممو خاں نے اس بار ذرا بھاری آواز نکالی۔

"میں آموں کی باغبانی کرتا ہوں۔ میں نے سب کچھ آموں کے باغوں اور آموں سے سیکھا ہے۔ کتنی ترشی اور کتنی مٹھاس سے لذت پیدا ہوتی ہے، یہ بات میں خوب جانتا ہوں۔" پھر وہ شوکت سے مخاطب ہوا۔

"بیٹی۔ شہباز صاحب کچھ نہیں کریں گے۔ آموں کی فصل تیار ہو گئی ہے، میں کروں گا تمھارا کام۔ سکھاؤں گا سبق اس بکر قصاب کو۔"

"تم کیا کرو گے؟" شہباز نے مزہ لیا۔

"اس کو آم کھلاؤں گا۔"

"لاٹھیاں برسوا دو گے، اور کیا۔"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر۔۔؟" شہباز نے اسے غور سے دیکھا۔

"کھانا۔۔ میں نے سب کچھ آم سے سیکھا ہے، کیسے اپنی بقا کے لئے لو دھوپ سہی جاتی ہے۔ کیسے گرم تھپیڑے کھائے جاتے ہیں اور چپکے چپکے چاشنی اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور پھر کس طرح پتوں کی آڑ میں چھپ کر جیا جاتا ہے۔ یہ سب مجھے آم نے سکھایا ہے۔ یقین کیجئے اس بکر قصاب کو صرف آم کھلاؤں گا۔"

شہباز کو ہنسی سوجھی 'تو گویا آم نہ ہوا تمھارا شناختی کارڈ ہو گیا۔"

"اس میں کچھ زیادہ شک بھی نہیں۔" ممو خاں سنجیدہ تھا۔ "اچھا آم پیدا کرنا اچھی غزل کہنے کے برابر ہے۔ خدا کی قسم ہماری تہذیب کی مٹھاس کا حال بھی آم کی مٹھاس کی طرح ہے۔"

"ہماری سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"ہماری سے مراد ہے آج کا ہندوستانی مسلمان۔ ترکی کا مسلمان سالا دسہری آم نہیں پیدا کر سکتا ہے۔"

"تم اب اپنی اس MANGOISM کو میڈیا تک پہونچاؤ۔" شہباز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ شاید پوری طرح سنجیدہ نہیں۔" اس نے کہا "آم کا بدل کچھ اور نہیں آم ہی ہے۔" پھر وہ ایک دم سے شوکت جہاں کی طرف پلٹا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آؤ بیٹی ہم

قدرت سے ابھی ملتے ہیں۔"

شوکت جہاں ممو خاں صاحب کے ساتھ چلی گئی۔ محفل برخاست ہوئی تو شہباز اکیلا رہ گیا۔ وہ اپنا ایک گال کھجاتے ہوئے بار بار سوچتا رہا۔

"مجھے کتنا وقت لگے گا بھلا؟" اس نے توقف کیا۔

"کتنا صبر اور ضبط کرنا پڑے گا مجھے۔ اتنی باتیں مسلمانوں کے گلے سے اتارنے کے لئے؟" اس نے پھر توقف کیا۔

"مسلمانوں کو یہ بتانے کے لئے کہ آج ہندوستان میں تین لاکھ سے بھی زیادہ مسجدیں ہیں جب کہ ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد کہیں کم تھی۔"

وہ بے چین ہو گیا آنکھیں کچھ بھیگ سی گئیں، وہ پھر اندر سے تڑپا۔

"کتنا انتظار کرنا پڑے گا مجھے یہ دیکھنے کے لئے کہ مسلمان خود یہ محسوس کرنے لگے کہ مسلم کشی کا بھیانک ہوا بہت حد تک ہماری زرد صحافت کی دین ہے۔ ورنہ ملک میں ہر برس مسلم مدرسوں کی تعداد تو بڑھتی چلی جا رہی ہے۔"

"یکایک شہباز خاں کی توجہ ایک بار پھر ممو خاں کے اس جملے پر مرکوز ہو گئی جو چلتے چلتے انہوں نے کہا تھا۔ "آم کا بدل کچھ اور نہیں آم ہی ہے۔"

شہباز نے سوچا، سوال یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاقی کردار کی چاشنی سے دوسرے کو اپنا گرویدہ بنانے میں کتنا کامیاب ہو رہے ہیں۔؟

ممو خاں دھیرے دھیرے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور قدرت اللہ سے عبدل قصاب والی روداد پوری تفصیل سے سن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ شوکت جہاں کی بھی زوردار خبر لیتے رہے۔

"ارے تم کو سیاست بازی سے کیا لینا دینا ہے۔ باپ مر چکے ہیں تمھارے۔ اب تم پارٹی وارٹی کے چکر چھوڑو۔ یہ سب ان کی زندگی تک ہی ٹھیک تھا۔"

قبل اس کے شوکت کچھ جواب دیتی، وہ پھر قدرت اللہ کی داستان سننے میں لگ جاتے۔ پھر انھیں غصہ آتا تو قدرت اللہ کو چھوڑ شوکت پر ٹوٹ پڑتے۔ "کیا کر رہی ہو آج کل؟"

"لڑکیوں کے لئے ایروبک (AEROBIC) کلاسز چلا رہی ہوں۔"

"کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟"

"یہی کوئی تین ہزار روپے ماہانہ"

"مکان تو تمھارا موروثی ہے۔۔اور تین دکانیں بھی تو ہیں؟"

"جی ان میں سے صرف ایک میری ہے۔"

کتنے کرائے پر اٹھی ہیں؟

"پندرہ سو۔"

"میری مانو تو شادی کر لو۔ لڑکا میں تلاش کر دونگا۔ مگر پٹھانوں کے لڑکے عورتوں میں بہت گھستے نہیں ہیں یہ تم کو بتائے دیتا ہوں۔" پھر ممو خاں نے بار بار شوکت جہاں کو شادی کے معاملے میں ٹٹول کر بھی اس کا عندیہ نہ پایا تو بولے۔

"بھئی کیسے رہو گی؟"

"خدمت خلق کر کے رہ لوں گی۔ میرا بالکل ارادہ نہیں ہے شادی وادی کا۔"

"تمھارے باپ کی کچھ اور جائداد بھی تو تھی۔"

"وہ مقدمے بازی میں پھنسی ہے۔" شوکت نے بتایا۔

پھر ممو کو اس بات پر غصہ آگیا کہ شوکت بکر قصاب کو سبق سکھانے کے لئے شہباز خاں سے مدد مانگنے کیوں گئی تھی۔ ایک دم سے بولے۔

"ارے بیٹا ہمارا بھی کچھ فرض ہے تم پر۔ تمھارے باپ نے بڑی محبتیں لٹائی ہیں ہم پر خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ پھر انہوں نے شہباز پر بھی دو ہاتھ گھما دیئے اور بولے۔

"شہباز کسی کام کا آدمی نہیں ہے۔ انسان نوازی میں اس قدر آگے چلا جاتا ہے کہ شیطان نوازی NEGLECT ہو جاتی ہے۔ شیطان بھی آپ کی چپت تب ہی کھانے کو تیار ہو گا جب آپ اس کا سر تین بار سہلا چکے ہوں گے۔ پر شہباز بے وقوف کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔" پھر ممو خاں نے دو تین بار زور زور سے اقرار میں گردن ہلائی جیسے دل ہی دل میں کسی خیال کی زوردار تائید کر رہے ہوں، پھر بولے۔

"ہاں عائشہ میں یہ GUTS تھے۔ وہ جانتی تھی کہ شیطانیت کو کیسے، کتنی دیر اور کس حد تک خوش رکھا جانا ضروری ہے" پھر وہ جوش غضب سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ انھیں خیال نہیں تھا کہ ان کا موٹا سا ازار بند لٹک کر زمین کو چھو رہا ہے انھوں نے شوکت کو ایسے گھورا جیسے وہی سماج کی ساری خرابیوں کی جڑ ہو اور بڑبڑائے۔

"تم ابھی بچہ ہو! تمہیں کیا بتاؤں۔ پریشانی ساری یہ ہے کہ ہم نے بہت زیادہ نیک بننے کے چکر میں رحمانیت کو مجہول کر دیا ہے۔" پھر وہ ایک دم سے قدرت کی طرف پلٹے۔

"بے فکر ہو جائے، میں سب سمجھ گیا۔ میرے آدمی کو کل عبدل بکر قصاب کو دور سے دکھا دینا۔ اور ایک بات سنو" وہ قدرت کو کسی قصائی کی طرح بھیانک آنکھوں سے گھورتے ہوئے شاہانہ رفتار سے اس کے سر پر آکر کھڑے ہو گئے اور بولے۔

"ناظم علی اینڈ سنس کی دکان پر چلے جاؤ شیروانی کا کپڑا کٹوا کر سلنے کے لئے دے دو اور اس سے کہو بل میرے پاس بھجوا دے۔"

(۵)

"عبدل کو مع اس کے چند دوستوں کے باغ تک لانے کا پلان بنا۔ ممو خاں کے وفادار پشتینی ملازم کالے خاں 'آپریشن عبدل' کے لئے تعینات کئے گئے اور حسب معمول ممو خاں صاحب پردے کے پیچھے رہے۔ کالے خاں کے آدمی عبدل اور ان کے دو بھتیجوں کو باغ میں لے کر آئے۔ سورج اترنے میں ابھی دیر تھی۔ باغ کے اندرونی حصے میں جہاں رہٹ کا ٹھنڈا پانی بھی تھا اور ایک چارپائی بھی، عبدل کو وہاں بٹھایا گیا۔ کچھ آم رہٹ کے چھوٹے سے حوض میں ڈال دئے گئے اور رہٹ سے کنویں کا پانی نکال کر حوض کو لبالب بھر دیا گیا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں پڑے ہوئے آم جب تک ٹھنڈے ہوتے، پکے پکے خوش رنگ اور خوش جمال آم توڑ کر چیڑ کی دو پیٹیوں میں بھرے گئے۔ گرمی بہت تھی، کنویں اور رہٹ اور حوض اور ٹھنڈے پانی کو دیکھ کر عبدل نہانے کے لئے مچلا۔ کالے خاں کے آدمی نے، جو عبدل کی میزبانی کے لئے باغ میں پہلے سے مقرر تھا، عبدل کو خوب نہلایا۔ ابھی عبدل اس کام میں مگن تھا کہ اسے خیال آیا کہ باغ میں اس کے اور اس کے دو بھتیجوں

کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ پہلے باغ والوں کے وہ لوگ جن کے ساتھ عبدل شہر سے باغ آیا تھا، کہیں غائب ہوئے۔ پھر وہ میزبان غائب ہوا جس نے انھیں باغ کے اندر خوش آمدید کہا تھا۔ باغ میں داخل ہونے والے راستے پر اردو اور ہندی میں ایک آگاہی درج تھی کہ یہ باغ ممو خاں صاحب کی ذاتی ملکیت ہے اس میں مالک کی اجازت کے بغیر داخل ہونا اور ملکیت کو کسی طرح کا نقصان پہونچانا غیر قانونی ہوگا۔ عبدل جب نہا رہا تھا تو اس کے بھتیجے آموں سے بھری پیٹیوں کے منھ بند کرنے کے لئے ان پر تختے جڑ رہے تھے۔ عبدل نے پہلے دوز دور نظر دوڑا کر خوش آمدید کہنے والے چوکیدار کو تلاش کیا۔ پھر حوض سے باہر نکل کر دو تین بار اسے آواز دی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ اس وقت باغ میں داخل ہونے والے راستے کی طرف سے پیڑوں کے پیچھے سے چند لٹھیت ہاتھوں میں تیل پلائی لمبی لمبی لاٹھیاں لئے اور ناکوں کو انگوچھوں سے ڈھکے اس کی طرف آتے دکھائی دئے۔ قریب پہنچنے پر وہ سب جیسے معاملے کو تاڑنے کے لئے ایک ساتھ ٹھہر گئے۔ لمبی قلموں والے گانجے کی چلم کی گرمی سے کچھ جلی موچھوں والے لٹھیت نے جس کی عقاب جیسی تیز اور نوکیلی آنکھیں تھیں سوالوں کی گولیاں داغنا شروع کر دیں۔

"کون ہو۔ تم لوگ ؟"

"کہاں سے آئے ہو ؟"

"کس کی اجازت سے اندر آئے ؟"

"یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

"یہ آم کس نے توڑے ؟"

"جھوٹ مت بولو۔ کہاں ہے وہ جس نے یہ آم تڑوائے ؟"

"کالے خاں صاحب نے بلایا ہے تو ان کی پرچی دکھاؤ۔"

"پرچی تو نہیں ہے۔"

"ممو خاں صاحب سے ملے تھے۔ ؟"

"نہیں۔۔"

"تو یہ باغ تمہارے باپ کا ہے کیا۔۔ ؟"

"اے باپ دادا مت کرنا۔۔۔ 'عبدل میاں کچھ اکڑے۔

"باندھ دو پہلے ان لونڈوں کو" لمبی قلم والے لٹھیت نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

ان میں سے دو ایک کے کندھے پر کنویں سے پانی نکالنے والی رسیاں لٹک رہی تھیں۔ بھتیجے بندھنے سے پہلے اچھلے کودے تو ان کی چاند پر کئی چڑ دھے پھٹاپھٹ داغے گئے پھر عبدل کو سمجھایا گیا۔

"آج سنیچر کا دن ہے۔ تھانہ انچارج آدھا سرکار کا اور آدھا ممو خاں صاحب کا دوست ہے پیٹیوں میں چوری کا آم برآمد ہو چکا ہے۔ آج بند کئے گئے تو اتوار اور سوموار دو دن اور بند رہو گے کہ سوموار کو محرم کی چھٹی ہے، عدالت بند رہے گی۔ اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ جو آم توڑ کر حوض میں ڈالے گئے ہیں انھیں کھا ڈالو۔۔" بیچارے عبدل نے بہت کہا کہ باغ میں آیا نہیں لایا گیا ہے اور وہ چور نہیں بکر قصاب ہے۔ مگر ان لٹھیتوں میں سے کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔ ایک بولا۔

"بھیا ہم تو ہر فصل میں ایسی دو چار کہانیاں سنتے ہی رہتے ہیں۔۔" دوسرا بولا:

"تم تو چکوے ہو۔ یہاں کبھی کبھی جنٹلمین لوگ بھی گھس کر پھنس جاتے ہیں۔"

"آم چارپائی پر لاکر رکھے گئے۔ لمبی قلموں والے نے اس میں سے آم اٹھا کر آدھے آم کا چھلکا اتار اور کاٹ کر عبدل کو پیش کیا۔

"ذرا یہ بے چھلکے کا آم کھا کر بتاؤ تو کیسا ہے؟"

عبدل چپ بیٹھا رہا اس نے ہاتھ آم لینے کے لئے نہیں بڑھایا۔ لمبی قلم والا دو پل انتظار کرتا رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ عبدل کی گردن ویسے ہی جھکی ہوئی ہے اور وہ نہ آم کی طرف دیکھ رہا ہے نہ ہاتھ بڑھا رہا ہے تو وہ بڑے پیار اور دلار والے لہجے میں بولا۔

"تمہارے پیجامے کا ناڑا کھول کر، اس چارپائی پر اوندھا لٹا کر یہ لاٹھی اندر تک اتار دی گئی تو پھر اس کے بعد تم نے آم کھایا تو کیا مزہ آئے گا؟ پھر تو یہ بھی نہ بتا پاؤ گے کہ کھٹا تھا یا میٹھا۔۔"

عبدل کا ہاتھ بڑھ گیا۔ آم لے کر اس نے زہر مار کیا۔۔۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مجھے جانے دو۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"آم کیسا ہے؟" لمبی قلم والے لٹھیت نے سوال کیا۔

"سچ کہتا ہوں آم چرانے نہیں آیا تھا۔۔"

"ابے ماں کے یار، یہ بتا آم کیسا ہے۔؟"

"اچھا ہے۔" وہ لٹھیت کے پیر پکڑتے ہوئے بولا۔

"بنا چھلکوں کا آم ہم آدمیوں کو کھلاتے ہیں، تو چھلکوں کے ساتھ کھا۔"

پھر عبدل کو چھلکے دار آم کھلائے گئے۔ جب وہ پانچواں آم کھا رہا تھا تو اس کا پیٹ پھول چکا تھا اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ پھر چھاتی پر سوار ہو کر چار آم اور کھلائے گئے۔ جب اس کی ناک اور منہ سے جھاگ چھوٹنے لگا تو لمبی قلموں والے نے اس کی چھاتی پر سوار مسٹنڈے سے لٹھیت کو جو کپڑے سے منہ چھپائے تھا حکم دیا کہ ابھی تین آم کھانے کی جگہ اور باقی ہے۔ عبدل نے اپنے سینے پر قے کر دی۔ اس کی آنکھوں کے سفید سفید گولے بار بار پھٹے پڑ رہے تھے۔ پسینے سے اس کا آدھا بدن چپچپا رہا تھا۔ اس کے بڑے بھتیجے نے جو سامنے ہی پیڑ سے بندھا کھڑا تھا یہ منظر دیکھ کر پاجامے میں پیشاب کر دیا تو ایک لٹھیت نے ایک بالٹی پانی اس کے اوپر اتنی زور سے اچھالا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ پھر اس نے ایک آم اٹھا کر اس کے منہ میں اس طرح ٹھونس دیا کہ وہ نہ نگل سکتا تھا اور نہ اگل سکتا تھا۔ اس کے جبڑے کے دونوں کنارے اتنی بری طرح سے کھنچے ہوئے تھے کہ کھال سے خون بہنے کو تھا۔

عبدل سے کہا گیا کہ وہ حلق میں اپنی بیچ ولی انگلی خوب اندر تک ڈالے۔ جتنی بار عبدل نے انگلی اندر ڈالی اس کی چھاتی پر قے کی رطوبت کے ساتھ کچلے ہوئے تازے آم کے ہرے پیلے چھلکے بھی شامل ہوتے۔ عبدل کو قے کرا کے جب پیٹ میں دو آموں کی جگہ لمبی قلم والے نے بنوالی تو عبدل کو پھر دو آم ٹھسائے گئے اور جب اس کے منہ سے جھاگ دوبارہ نکلنے لگا اور آنکھیں اوپر کو چڑھنے لگیں اور نبض ماند پڑنے لگی تو اس کو اوندھا کر کے دونوں پیر تین فٹ اوپر اٹھا کر پھر قے کرائی گئی۔ وہ کسی ذبح ہوتے بکرے کی طرح حلق سے آوازیں نکالنے لگا۔ پھر اس کے منہ میں دوا کی گولی کو سفوف کی شکل دے کر پھنکایا گیا۔ کئی الٹیاں ہوئیں تو اس کا پیٹ، کچھ ہلکا ہوا۔ لیکن وہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اب اپنی گردن کو ایک جگہ روک نہیں پا رہا تھا۔ اس جان لیوا نقاہت سے اس پر بار بار غشی طاری ہونے لگی۔ اس سے قبل کہ وہ بے ہوش ہو اس کے کانوں میں لمبی قلموں والے کی آواز آئی۔

"یہ پانچ آم الگ رکھ دو۔ ہوش آنے پر کھلانا۔"

لیکن دو پل بعد عبدل اس کھری چارپائی پر حالت بیہوشی میں لاش کی طرح بے سدھ پڑا تھا اور اس کی چھاتی پر پڑی رطوبت پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

مزے کی بات یہ تھی کہ ممو خاں اور ان کا لفٹیننٹ کالے خاں دونوں حلف اٹھا کر یہ کہہ سکتے تھے کہ انھوں نے کبھی عبدل بکر قصاب کو دیکھا تک نہیں۔

ایک دن شوکت جہاں جب عبدل کی دکان کے پاس سے گزری تو ایک پل رکی۔ پھر

دھیرے سے عبدل سے بولی۔ "اچھے آم جب کھاناہوں تو مجھے بتادینا۔"

کارخانے سے کوٹھی کے درمیان جس راستے سے شہباز گزرتا کئی مسجدوں سے لاوڈ اسپیکر ایک ساتھ شور مچاتے ہوئے ملتے۔ جن چہروں پر اس کی نگاہ اٹھتی وہ مسلمانوں کے چہرے ہوتے۔ ان مناظر میں وہ مسلم اوباش لونڈے ہوتے جو نہ مسجدوں کے کام کے تھے اور نہ اسکولوں کے وہاں تو گندے چائے خانوں میں طشتری میں چائے انڈیل کر چسکی لگانے والے وہ مسلمان ہوتے جو یا تو چھوٹے موٹے دفتروں میں معمولی ملازم تھے یا چپراسی، کچہریوں میں منشی تھے یا میونسپلٹی میں پلمبر، سائکل کا پنچر بناتے تھے یا گیرجوں میں گاڑیاں دھوتے تھے، بسوں میں جیب کاٹتے تھے یا سنیما کے ٹکٹ بلیک کرتے تھے یا پھر وہ نیم حکیم جو کمپونڈری کرتے کرتے خود ساختہ ڈاکٹر بن گئے تھے۔ اس کے بعد ہزاروں چہرے تھے، جن میں باربر تھے، جلد ساز اور دفتری تھے، سبزی فروش تھے، جوتے بنانے والے تھے، اسکوٹر میکنیک تھے، حلوائی تھے، پرچون کے دکاندار تھے۔

انسانی حقوق کی سرگرم کارکن عائشہ نے بڑی جدّوجہد کے بعد اپنے شوہر کے ذہن کے کیمرے میں جو کچھ سیدھے فوکس میں لاکر کافی اجاگر کر دیا تھا در اصل وہی اب شہباز کی اصل پریشانی بن چکا تھا۔ پہلے تو اس نے بہت کوشش کی کہ وہ جب سنیماہال کے کنارے سے نکلے تو ٹکٹ گھر کی اس کھڑکی کی طرف نگاہ نہ ڈالے۔ لیکن سامنے پہونچ کر اس کا جی نہ مانتا۔ وہ گاڑی دھیمی کر لیتا اور غور سے چلچلاتی دھوپ میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے اور قریب ہی بہتی ہوئی نالی کے کنارے ان برقعہ پوش عورتوں کو غور سے دیکھتا جو گھنٹوں لائن میں صرف ایک اینٹ کے چبوترے پر بیٹھے بچے کے منہ میں چھاتی دیے امتابھ بچن کی کسی فلم کو دیکھنے کے لئے سر سے، ماتھے سے، منھ سے، کولھوں اور رانوں سے بدن کا پسینہ نل کی ٹوٹی کی طرح بہایا کرتیں اور لائن میں ذرا بھی آگے پیچھے ہو جانے پر پہلے ایک دوسرے کی نقابیں نوچتیں، پھر گریبان، اس کے بعد بالوں کے تازے تازے گچھے ایک دوسرے کی مٹھی میں نظر آتے پھر جو مسٹنڈی ہوتی وہ کمزور کی چھاتی پر سوار ہو کر بیٹھ جاتی۔ عام طور پر سائبان کے نیچے اپنا ڈنڈا پہلو میں رکھے بینچ پر لیٹا کانسٹبل اپنی نیند نہ خراب کرتا تھا۔ ہاں اگر کوئی کم سن اور گوری چمڑی والی عورت زد میں ہوتی تو وہ کچھ دیر مزہ لے کر جھوٹے غصے کا اظہار کر کے لڑنے والیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا۔ پھر تھوڑا الگ کھڑے ہو کر گوری چمڑی والی کو دیکھ دیکھ کر

بھونڈے پن سے مسکراتا رہتا۔ چلچلاتی دھوپ میں سینما کی ٹکٹ والی لائین میں لگی ان برقعہ پوشوں کو پسینہ بہاتے بٹوے سے ڈلی تمباکو پھانکے، چھاتیاں چپڑواتے کانسٹبل کے ڈنڈے کھاتے روز دیکھتے دیکھتے ہی شہباز خان کے دل میں اس صنف سے دلچسپی بڑھی تھی۔

آخر یہ عورت ہے کون؟

اس کے دل میں جستجو جاگی تھی۔ یہ برقعہ پہننے والی، ٹکٹ کی لائن میں کنگھی چوٹی کر کے آنکھوں میں کاجل پیرا کر ٹھیلے والے سے خریدے ہوئے سستے ہار پہن کر پاکیزہ فلم میں مینا کماری کی شب انتظار کو اپنی شب انتظار مان کر اس کے ساتھ گانے لگتی تھی۔

یہ چراغ بجھ رہے ہیں
مرے ساتھ جلتے جلتے
یہ چراغ بجھ رہے ہیں
مرے ساتھ جلتے جلتے

آخر اپنی آنکھوں کو کیوں بھگو لیتی تھی وہ؟ اور پھر چپکے سے دوپٹے سے انھیں پونچھنے میں ایک پیوند لگی آسودگی سی کیوں محسوس کرتی تھی؟ شہباز کی مرحوم بیوی عائشہ کے رہائشی دفتر کی دہلیز پر کہاں کہاں کی اور کیسی کیسی عورتیں پہونچتی تھیں۔ ان کے چہرے۔ ان کے کپڑے۔۔ شہباز بیوی کو ٹوکتا۔

"یار گھر پر بھی وہی چہرے وہی عورتیں۔۔۔ تم اپنا دفتر کہیں اور لگایا کرو۔۔ کوٹھی میں سب طرف عورت ہی عورت ہو جاتی ہے۔"

"عورت تمہارے راستے میں بھی ہے، تمہارے دفتر میں بھی ہے اور تمہارے بستر پر بھی ہے۔" وہ چٹکی لیتی

"یار تمہارا FEMINISM لگتا ہے مجھے مسجد کی چٹائی کی طرح لپیٹ کر کہیں کونے میں کھڑا کر دے گا۔"

وہ مسکراتی۔ "میں چاہتی ہوں تم سنجیدگی سے ذرا اس کھڑکی میں بھی جھانکو جہاں تمھیں آگے آنے والی وہ عورت نظر آئے گی جو ابھی لڑکی ہے۔"

"مطلب۔۔۔۔؟"

"میں آج کے نئے اور خوشحال کر خنداروں کے طبقے کی بات کر رہی ہوں۔ ان لوگوں کی

جو برتن بناتے ہیں تالے بناتے ہیں۔ قالین بنتے ہیں۔ اور اپنے ڈرائنگ روم میں نصر من اللہ و فتح قریب کے طغرے سجاتے ہیں، روح افزا کا شربت جن کا STATUS SYMBOL ہے۔ اردو ڈائجسٹ کو سنٹر ٹیبل پر رکھ کر جو خود کو تعلیم یافتہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں میں اس طبقے کی ان مسلم شریف زادیوں کی بات کر رہی ہوں جو مجہول اور ناکارہ شرافت کے جبر کے بوجھ تلے چھٹپٹاتی ہیں۔ ہائر سیکنڈری تک پڑھتی ہیں۔ سبز دوپٹے میں قرآن ختم کرتی ہیں۔ پھر سہیلیوں کے عاشقوں کو لکھے جانے والے خطوں کے لئے مشاعروں اور ڈائجسٹوں سے نوٹ کئے گئے شعر فراہم کرتی ہیں۔۔۔ آلو کی ٹکی اور مٹر کی چاٹ میں ڈھیروں سرخ مرچیں ڈال کر کھاتی ہیں اور "قسم کلام پاک کی" کے تکیہ کلام کے ساتھ دروازوں کی درازوں سے اپنی بہنوں بھتیجیوں کے شوہروں کی دست درازیوں اور چوما چاٹی کا احوال چاٹ کے چٹخارے لے کر بیان کرتی جاتی ہیں۔ اور آدھا گھنٹہ "سی سی" کر کے مرچوں جلے منہ کو ہوا دیتی رہتی ہیں۔ پھر اسکول کے راستے میں نکڑ والی کاپیوں کی دکان پر پنسل لینے کے بہانے ادھر ادھر نظر بچا کر کرائے پر لی گئی پلے بوائے Playboy میگزین کو شلوار کے نیفے میں گھڑس کر غسل خانے تک پہنچانے اور پھر وہاں گہری سانسوں، گرم کن پٹیوں اور تمتماتے گالوں کے ساتھ ننگے آسنوں کی ورق گردانی کرتی ہیں، اور ہیجان سے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انھیں تر کرتی ہیں۔ اور پھر باہر نکل کر چڑیا جیسے ہانپتے دھڑکتے دل کی رفتار اپنی سہیلی کو سنانے کے بہانے اس کا ایک ہاتھ اپنے سینے پر قدرے دیر تک رکھ کر اس کی ہتھیلی کی گرمی کی انجان مگر بھلی لگنے والی سرسراہٹ کا مند مند آنکھوں سے مزہ لیتی ہیں اور "ہائے اللہ" کہہ کر اتنی لمبی سانس چھوڑتی ہیں جیسے سیکڑوں میل دور سے بھاگی چلی آ رہی ہوں۔۔

"اتنا سب کچھ سانس روک کر سن لینے کے بعد شہباز نے بیوی کی آنکھیں چوم لیں اور بولے۔

"واہ، کیا کمال کا مشاہدہ ہے۔"

"ایک عورت اور بھی ہے" عائشہ جیسے کھوئی کھوئی سی بولی۔

"اب کون ہے؟" شہباز بناوٹی خوف کے ساتھ بولا۔

"میری دوست ارچنا تم کو اس عورت سے ملوائے گی۔"

"وہ ہے کون۔؟"

"آر ایس ایس کے ایک غیر معروف بازو (WING) راشٹریہ سیویکا سمتی کی ایک پرسچاریکا۔

شوکت جہاں نے اپنی سنگار میز کے آئینے کو صرف اپنی "چھل بل "کو گھر سے باہر نکلنے سے پہلے آنکنے کے لئے ہی استعمال کیا تھا۔ اس دن وہ آئینے کے سامنے سے ہٹنے کو ہی تھی کہ اس کی ساری کا پلو سنگار میز کی دراز کے ہینڈل سے الجھ گیا۔ "کدھر چلیں؟" اس کی ساری کے کھنچے ہوئے پلو نے گویا اس سے سرگوشی کی۔

شوکت جہاں جانتی تھی کہ وہ کدھر کے لئے چلتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ جان کر انجان بنتے بنتے اس نے کافی لمبا وقت نکال دیا تھا۔

"احتساب!" کوئی آواز سی سرسرائی اس پلو کی سرسراہٹ میں۔ شوکت جہاں اس آواز کو بھی خوب جانتی تھی۔

تمھیں قسم ہے اپنے مرے ہوئے باپ کی۔ ایمانداری سے بتادو کہ تم راج نیتی میں کیوں جانا چاہتی تھیں۔

مگر شوکت جہاں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آئینہ کی اس گستاخی کو در گذر کر دیا۔ اور اپنا پرس کندھے پر لٹکا کر اور لپ اسٹک کو ایک بار پھر فنشنگ ٹچ دیتے ہوئے باہر کے دروازے کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے خیال آیا۔ دھوپ بھی تیز ہے، آٹو کے لئے دیر تک کھڑا رہنا پڑے گا۔ پھر جب آٹو آئے گا تو اس قدر بھرا ہوا ہوگا کہ اندر بیٹھتے وقت بھیڑ بھڑ کے کے بہانے کوئی دو ٹکے کا تاڑی پی کر نالی میں پڑے رہنے والا کامگار کولھے پر ہتھیلی رگڑے گا اور اپنی داہنی کہنی ذرا سے ہچکولے پر اس کے سینے تک پہونچا دے گا۔ وہ اس مرد کو گھور کر دیکھے گی لیکن وہ کسی اور طرف ایسے دیکھ رہا ہوگا جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔ پھر وہ ٹمپو اسے کہیں اتارے گا۔ وہاں سے وہ کہیں اور جائے گی۔ پھر وہاں سے کہیں اور، اور پھر کہیں اور سے گھر اور گھر سے غسل خانے، غسل خانہ سے باورچی خانے اور تب بے شکن چادر والی مسہری کے قریب ہی رکھی سنگار میز کا آئینہ اور آئینے کا پھر اس تمسخرانہ اور غلیظ لہجے میں ہمیشہ کی طرح بدبدانا۔

تمہیں قسم ہے اپنے مرے ہوئے باپ کی۔

ایمانداری سے بتاؤ۔

بتاؤ کہ تم راج نیتی میں کیوں جانا چاہتی تھیں۔

"پہلے اس کمینے سے نپٹ لیا جائے۔" وہ بڑبڑائی اور واپس آکر دھم سے مسری پر گر پڑی پھر پنکھا بند پا کر اسے یاد آیا۔ آئے دن بھاری تخفیف کے سبب بجلی غائب رہتی ہے۔ لیکن پرتاپ شکلا کے گھر بجلی کبھی نہیں جاتی۔ سارے کمرے ٹھنڈے ٹھنڈے کولروں سے برف خانہ بنے رہتے ہیں گھر میں کوئی رکے تو کیسے رکے۔

شوکت جہاں نے سچے دل سے اپنے کو ٹٹولا۔

وہ چاہتی تھی اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔

جلسوں جلوسوں میں، نامی گرامی نیتاؤں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو۔

اس کے دروازے پر جیپوں، سرکاری ایمبسڈر کاروں کے ہارن بجیں۔

وہ تازہ اور شگفتہ قہقہوں سے چائے کی پیالیوں اور مشروبات کے گلاسوں سے آنے جانے والوں کا استقبال کرے۔ اس لئے وہ کھدر کی ساڑی پہننے لگی۔ پھر فیملی پلاننگ کی حمایت میں مسلمان کرخندانوں کی ٹولیوں میں تقریر کرنے لگی۔ اور پھر۔۔۔ پھر ایکا ایکی پرتاپ شکلا سے بحث کا وہ کڑوا کسیلا دن اپنی ساری بدمزگی کے ساتھ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا جس دن اس نے پرتاپ کی دی ہوئی دو ڈبے مٹھائی نالے میں اچھال دی تھی۔ اس نے غصے میں پرتاپ شکلا سے کہا تھا۔

"آپ کو منتری بننے کے لئے اردو اور علی گڈھ کو گالی دینا ضروری ہے؟"

"میرے لئے نہیں۔۔۔" پرتاپ بھڑک اٹھا تھا۔ "تمھارے لئے ضروری ہے۔ مین اسٹریم میں شامل ہونے کے لئے یہ باتیں ہندو تمھارے منہ سے سننا چاہتا ہے۔ لیکن تم سمجھنا چاہو تب نا۔۔۔!"

"یہ نہرو کا سیکولرازم تو نہیں ہے" شوکت نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"سیکولرازم کسی گھرانے کی جاگیر نہیں۔" پھر پرتاپ نے سامنے پڑے ہار پھول اور مٹھائیوں کے پیکٹ کی طرف اشارہ کر کے جو اس کے جنم دن کے موقع پر اسے پیش کئے گئے تھے، کہا تھا۔

"میں نے تم سے یہ شکایت نہیں کی کہ میرے جنم دن پر تم ہار پھول لیکر کیوں نہیں آئیں۔ لیکن میں تم سے یہ شکایت ضرور کروں گا کہ تم اپنے نیتا کی بات نہیں مانتیں۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ مسلمانوں میں جا کر تم کو پرچار پرسار کا یہ کام کرنا ہے کہ انھیں اردو اور علی گڈھ سے اب اوپر اٹھنا چاہیئے تو تم ویسا ہی کرو۔"

اس بات کو سن کر وہ پرتاپ سے بہت جھگڑی تھی۔ مولانا آزاد کے ایک خطبہ کے کچھ حصے بھی اس نے پرتاپ کو سنائے تھے۔ لیکن جب پرتاپ نے شوکت کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا تو وہ جل کر بولی تھی۔

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ کانگریس ان ایکتا میں ایکتا کو مانتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پرتاپ نے چڑھ کر جواب دیا تھا۔ "تو کانگریسی نہیں ہوں میں، گھس آیا ہوں کانگریس میں ؟"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ میں پہلے آر ایس ایس میں رہا ہونگا۔ ان لوگوں نے گھسیڑ دیا مجھے کانگریس میں، تم بھی سب سے یہی کہو۔ نہرو آزاد اور جانے کون کون سب اپنی اپنی قبروں میں سو رہے ہیں۔ ہم سے کیا بات کریں گے وہ؟ NEW POLITICAL CUMPULSIONS ہمیں جھیلنا پڑ رہے ہیں۔ انھیں نہیں۔۔۔ وہ سب تو اسکروڈرائیور ٹکنالوجی کی طرح اسکروڈرائیورڈیماکریسی جس کے الگ الگ حصے ہم نے باہر سے منگا کر اپنے یہاں جوڑ لئے تھے، ہم کو پکڑا کر کھسک لئے ہیں۔ اور ان سالے مسلمانوں کے لئے کیا کہوں، وہی مثل ہے کہ بدن پر نہیں لتہ اور پان کھائیں البتہ۔۔۔ مسلمانوں کو روٹی تو مل نہیں رہی۔ اردو بولنے کی عیاشی میں مرے جارہے ہیں، ارے بھائی پہلے چوتڑ ڈھکنے کا پربندھ کرلو، تب اردو بولو بولتے ہوئے اچھی بھی لگے گی۔"

پھر اس نے شوکت جہاں کے بھائی قدرت اللہ کو لے کر اس کے ہندو سامپردائک پارٹی کے اخبار کی ادارت کرنے کا طعنہ بھی دیا تھا اور مٹھائی کے دو ڈبے بھی تھمادئے تھے جو وہاں بہت سارے پڑے تھے۔

اس دن پرتاپ شکلا نے شوکت جہاں پر، یعنی ایک عورت پر، سب سے کاری ضرب لگائی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ایک عجیب سا شک اور ایک قدرے غیر موہوم سا وسوسہ شوکت جہاں سے یہ سوال کر بیٹھا کہ بی بی ذرا غور کر کے یہ بتاؤ کہ چوڑیوں سے کھنکتی ہوئی گوری کلائیوں والی اور ادا کے ساتھ تسلیم اور آداب کرنے والی مسلم گھرانے کی چہکتی ہوئی عورت کو بغل میں لے کر گھومنا اور اپنے فارم ہاؤسوں میں لے جانا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہندو دھانکوں کا STATUS SYMBOL بنتا جا رہا ہو۔ اس لئے اس نے پرتاپ سے کہا تھا۔

"اگر میں یہ پارٹی چھوڑ دوں تو۔۔۔؟"

اور پرتاپ نے جواب میں جیسے پورا خنجر اس کے سینے میں اتار دیا تھا۔
"تمھاری مرضی۔۔۔ کسی پارٹی میں بھی جاؤ، استعمال عیش و آرام کے لئے ہی کی جاؤ گی۔"

رکشے پر بیٹھ کر شوکت کو لگا تھا کہ پرتاپ کے دیئے ہوئے مٹھائی کے ڈبوں سے بو آرہی ہے، تو اس نے دونوں ڈبے رکشے پر بیٹھے بیٹھے نالے میں اچھال دیئے تھے۔ شوکت جہاں نے ودھایک پرتاپ شکلا کے دیئے ہوئے ڈبے رکشے پر سے نالے میں اچھال تو دیئے لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ آگے ایسا کیا ہونے والا ہے جو پہلے نہیں ہوا کرتا تھا۔ رات دس بجے کے آس پاس شوکت جہاں کا فون کھڑکھڑایا۔ گرمیوں کی رات تھی، کھلی چھت پر اس نے چارپائی کو پانی چھڑک کر ہلکا سا گیلا کر لیا تھا اور خالی بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں اس پر لیٹی تھی۔۔ اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف ودھانک پرتاپ شکلا کی بھدی سی آواز سنائی دی۔
"تو تم گھبرا گئیں۔۔؟"
"نہیں۔"
"تم پھر ڈر گئی ہو گی۔" وہ پورے اعتماد سے بولا۔ "سچ بتاؤ ڈر گئی ہونا۔۔"
"ہاں ڈر تو گئی ہوں۔ میں کیا سارا مسلمان ڈرا ڈرا سا ہے۔"
جواب میں پرتاپ دو پل بھونڈی ہنسی ہنستا رہا۔ پھر اپنے ایک ایک لفظ کو جما جما کر کہنے لگا۔
"آج کل دو طرح کے ڈر زیادہ چل رہے ہیں، تم کس ڈر سے ڈر گئی ہو۔؟"
"مطلب۔۔؟" شوکت نے پوچھا۔
"ایک وہ ڈر جو سماجی شریف زادوں کو ڈراتا ہے اور دوسرا وہ ڈر جس سے سیاسی حرامزادے ڈرتے ہیں۔"

شوکت کے جی میں آئی کہ رسیور رکھ دے لیکن ایسا وہ ایک آدھ بار پہلے بھی کر چکی تھی۔ یہ سوچ کر کہ ٹیلیفون کاٹ دینے سے رشتہ نہیں کٹے گا، (کیوں کہ پرتاپ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو چپ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں) شوکت جہاں نے سوچا کہ تھوڑی سی بات اور کر لے، اتنی بات کہ پرتاپ کو تھوڑا سا غصہ آجائے۔ غصے میں وہ اکثر ایسی باتیں کرتا تھا جن سے شوکت جہاں کو خود کو اور حالات کی سنگینی کو سمجھنے یا انھیں سہنے یا ٹال جانے یا پھر ان کی سفاکی سے سبق لینے کا موقعہ مل جایا کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ پرتاپ شکلا سے پہلی بار شروع شروع میں ملی تھی تو پارٹی میں اس کی

وہ حیثیت نہ تھی جو آج ہے۔ ویسے تو پرتاپ آج بھی ایک ودھایک ہی تھا۔ لیکن اب وہ مکھیہ منتری کے اس قدر قریب تھا جتنی خود اس کی کھال۔ وہ فون پر اداسی سے بولی۔۔

"اپنے بارے میں تو میں کچھ جانتی نہیں۔۔۔ آپ مکھیہ منتری کے چہیتے ہیں یہ ضرور جانتی ہوں۔"

"تو کیا ہول۔۔ ؟" وہ چہک کر جلدی سے کھلی آواز میں بولا۔ "جانتی ہو! اپنے بچاؤ کے لئے کل یہی مکھیہ منتری مجھے بھی دو کوڑی کا بنا سکتا ہے۔ تم نے سنا نہیں ہے کیا؟ کہتے ہیں جب بندریا جلنے لگتی ہے تو اپنے نیچے اپنے بچے کو رکھ لیتی ہے۔"

"آپ نے فون کیوں کیا!"

"میری کوئی بات بری لگی ہو تو مجھے معاف کردو۔ کل چار بجے گھر پر آؤ۔"

"کیوں۔۔ آپ کے گھر کیوں آؤں؟۔۔ آپ کے ذریعہ استعمال ہونے کے لئے؟۔۔"

"نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔!"

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔" شوکت جل کر بولی۔۔ تم عورت ہو جہاں بھی جاؤگی مرد کے استعمال مین ہی رہوگی۔"

یہ جملہ ادا کرتے ہوئے شوکت طے کر چکی تھی کہ جملہ ختم ہوتے ہی اسے فون رکھ دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بعد کم سے کم فوراً پرتاپ شکلا تو اسے فون نہیں کرے گا۔ اس لئے شوکت نے فون رکھ دیا۔ وہ چپ چاپ گیلے باندھوں والی چارپائی پر چت لیٹے کھلے کھلے صاف ستھرے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتی رہی۔

کیا وہ جانتی تھی کہ سیاست میں کیوں آنا چاہتی ہے؟ کیا وہ جانتی ہے کہ راستہ اتنا آسان نہیں ہے۔ یا تو وہ گھر بیٹھ رہے اور صبح سے شام تک بیٹھی رہے، یا پھر لیٹ جائے یا پھر دروازے پر کھڑی ہو جائے یا چھت پر چلی جائے یا بجلی چلی جانے پر ہاتھ کے پنکھے سے ہوا کرتی رہے اور مقدر کو کوستی رہے اور لمبے اکتا دینے والے دن تھکا دینے والی بے خواب راتیں جھیلے اور بار بار بستر سے اٹھ کر بتی جلا کر مچھردانی میں گھسے مچھروں کو اکتائے ہوئے من سے مارے پھر بتی بجھائے، پھر کروٹیں لے اور پھر نہ جانے کب سو جائے۔ یہ جو گوری چمڑی ہے اور یہ جو چتونوں کی تیکھی مار ہے اور یہ جو کسا کسا اور اٹھا سا جوبن ہے اور پھر سب سے زیادہ یہ جو ایک پارٹی مین باپ کے حوالے سے آنے جانے اور ملنے جلنے کا ایک موقع ہے۔۔۔ یہ بہت قیمتی ہے۔ گھر بیٹھے کچھ نہ ہوگا سارے بڑے کاموں میں

خطرہ تو ہوتا ہی ہے اور جوکھم اٹھائے بغیر۔۔۔ پھر فون کھڑ کھڑ لیا وہ اٹھی فون تک گئی مگر چونگا اٹھائے بغیر واپس آ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ گھنٹی دیر تک بجتی رہی پھر تھک ہار کر خاموش ہو گئی۔

شوکت جہاں کو یاد آیا وہ ایک پرتاپ شکلا نے اسے بتایا تھا کہ اس کے ایک منتری دوست کا شوکت جہاں پر دل آ گیا ہے۔۔۔ پرتاپ نے کہا تھا۔

"میرا وہ دوست بڑا نمبری ہے سالا۔ سسرے نے کبھی دھوتی کے نیچے جانگیہ نہیں پہنا۔ ایک دن تم کو دیکھ کر مجھ سے بولا تھا۔ یار اس کو پٹاؤ۔۔۔ دراصل پرتاپ کو غصہ اس بات کا تھا کہ اس کا منتری دوست کچا مال پرتاپ سے منگواتا تھا پھر اس سے کہتا تھا کہ وہ اس کو پکا کر کھانے کے لائق بنائے اور پرتاپ ہی کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی تھالی میں اس پکے ہوئے مال کو پروس بھی دے۔۔ شوکت نے ایک دن پرتاپ سے کہا تھا۔۔

"جب میں آپ کے ساتھ ہوتی ہوں تو آپ کچھ ڈرے رہتے ہیں۔"

"ہاں۔۔" اس نے اقرار کیا تھا۔

"اس لئے کہ تمھارے آس پاس کیا ہوتا رہتا ہے اس کی ہر دم خبر رکھنا سیکھو، ہر دم اپنی ہی دھن میں مست الست رہنے کی خطرناک اداؤں سے مشکل میں پڑ سکتی ہو۔"

"کیوں۔۔۔؟" وہ بھولے پن سے بولی۔

کیونکہ سماجی شریف زادوں اور سیاسی خبیثوں کی دنیا ہی الگ الگ ہیں۔" شوکت نے آنکھیں پٹپٹائیں اور بولی۔۔

"مطلب۔۔۔؟"

"مطلب ان الگ الگ دنیاؤں کے وسوسے الگ ہیں ڈر اور خوف الگ ہیں کہیں میں تمھیں اپنی گود میں نہ بٹھالوں کہیں کہ منتری اپنی وھسکی کا گلاس تمھارے ہاتھوں سے بنوانے کے لئے تم کو اپنے ساتھ پہاڑ پر نہ لے جائے اس لئے سماجی شریف زادے کا ڈر اور سیاسی حرامزادے کا ڈر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

تب شوکت جہاں کو اپنے آس پاس محلے میں، شہر میں بسی ہوئی بہت سی سماجی شریف زادیاں یاد آئی تھیں جن کے پرانے دروازے پر ٹاٹ کے پردے رہا کرتے تھے۔ جو ان پردوں کے پیچھے سے تانک جھانک کے مشغلے سے دل بہلاتی تھیں، کوئی فلمی گیت گنگناتے ہوئے صبح صبح روز کچی انگنائی کا کوڑا کرکٹ سمیٹتی تھیں۔ مرد کے لئے روٹیاں تھوپتی تھیں۔ بچوں سے چھاتیاں چچڑواتی

تھیں، شلوار کی میانی سے لیکوریا کی رطوبت پاک کرتیں اور سماجی شریف زدگی کی چادر اوڑھے چہرے پر جھریاں ابھر آنے پر اگر قسمت نے یاوری کی تو مدینے ہو آئیں نہیں تو اسپتال کے بر آمدے میں ہاتھوں سے مکھیاں ہنکاتے ہوئے لا الہ الا اللہ پڑھتے ہوئے آخری سانس لیتیں اور ملک عدم سدھار لیتیں۔

دو تین روز تک شوکت گھر سے باہر نہیں نکلی۔ ایک گہرا تلاطم تھا اس کے اندر، پھر وہی پچھلی سی کیفیت ہونے لگی تھی۔ وہی پرانا انجانا سا خوف، پھر وہی دانت پر دانت بیٹھ جانے والا اور جبڑے بھینچ جانے والا دورہ جو اس روز پڑا تھا۔

اس منحوس روز۔۔۔ شوکت اپنے خیالوں کی دنیا مین پہنچ گئی۔

ان دنوں اشفاق کی جوان بیوی کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے میکے بیٹھی ہوئی تھی، اور میرا باپ لکڑی کی نیلامی چھڑانے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جلاؤ لکڑیوں کا کاروبار تھا مگر اس کی آڑ میں قیمتی لکڑیاں بھی مال میں دبا کر نکال لی جایا کرتی تھیں۔ بازار بند تھا اس لئے اشفاق اپنے گھر پر تھا۔ مشتری رقیہ کے ساتھ میرے گھر آئی اور کسی بہانے سے مجھے گھر سے نکال لائی۔ سڑک پر اشفاق کے گھر کے سامنے سے جب ہم تینوں گذرے تو دروازے پر اشفاق کھڑا تھا، اسے کوئی کتاب دینے اور لینے کے بہانے مشتری ہمیں لیکر اس کے گھر کے اندر گئی۔ گھر میں اشفاق اکیلا تھا۔ اس نے صاف شفاف شیو بنایا تھا کپڑوں سے تیز سینٹ کی خوشبو بھی آرہی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹ زبان پر پھیر کر گیلے کر رہا تھا۔ مجھے نہ جانے کیسے کیسے دیکھ رہا تھا۔ مشتری نے مجھ سے کہا کہ میں آرام سے اشفاق کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں تب تک وہ دونوں دوسرے کمرے میں کتابوں کی الماری سے ناولیں تلاش کرلیں گی۔ دوسرے کمرے میں جاتے جاتے رقیہ شرارت سے اشفاق سے بولی تھی۔

"جب باتیں ختم ہو جائیں تو ہم دونوں کو پکار لیجئے گا۔" پھر میں اشفاق کے ساتھ کمرے میں اکیلی رہ گئی۔۔۔ اس منحوس دن مجھ کو مرد کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو بس اتنا کہ مرد اگر کچھ ہے تو، رانوں کے درمیان پیوست ہوتا ایک تیز دھار سفاک خنجر۔

ایک کبھی نہ مندمل ہونے والا کرب ناک اور شرمناک زخم۔

میں فرش پر کھڑی تھی اور میری رانوں اور پنڈلیوں پر سے بہتا ہوا تازہ تازہ خون میری ایڑیوں کو تر کرتا فرش پر ٹپک رہا تھا۔ میں نے مشتری سے مجھے میری پھوپھی کے گھر لے چلنے کو کہا، جب میں اپنی پھوپھی کی گود میں گری تو مجھے غش آگیا تھا۔ میرے جبڑے بھینچ گئے تھے اور اوپر کے

دانت نیچے کے دانتوں پر جکڑ گئے تھے۔

لیڈی ڈاکٹر جان پہچان کی تھی۔ میری پھوپھی زاد بہنوں کے یہاں ڈیلوریاں اس کے نرسنگ ہوم میں ہوتی تھیں۔ سات دن بھرتی رہی۔ چھ مہینے میں دوبار خون چڑھا، ماں تو جان گئی لیکن کسی نے میرے باپ کو اصلیت کی بھنک بھی نہیں لگنے دی۔ ورنہ وہ بستر پر پڑ جاتا، پھر پورے ایک سال میں دن کی روشنی سے بھی ڈرتی رہی۔ پیروں کی کوئی چاپ چارپائی کے قریب سے بھی گذر جاتی تو مین گھبرا کر بیٹھ جاتی۔ پھر یہ ہونے لگا کہ جب بھی میری شادی کی ذرا سی بات کانوں میں پڑتی تو فوراً میں دانتوں کے درمیان اپنا دوپٹہ رکھ لیتی کیونکہ خوف سے مجھ پر ویسا ہی دورہ پڑ جاتا، جبڑے ایک دوسرے سے چپک جاتے دانت بھنچ جاتے اتنی طاقت اور مضبوطی سے کہ پھر دیر تک علاحدہ نہ ہوپاتے اور پھر کئی دن تک ان میں دکھن ہوتی رہتی۔

انھیں دنوں شہباز میاں کی بیوی اور شوکت کی منہ بولی باجی یعنی عائشہ سے شوکت نے ہر دم اپنی پیٹھ پر چپکے رہنے والے، ایک بے نام سے بھیانک خوف کا ذکر کیا تھا۔ تب عائشہ باجی نے ہی اسے لڑکیوں کے ہیلتھ کلب میں جوڈو کراٹے سیکھنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنی موٹر میں بٹھا کر اسے لے گئی تھیں۔ اس کا فارم بھروا کر اپنے پرس سے فیس بھی ادا کی تھی۔۔ نہ جانے کیوں عائشہ باجی کے آس پاس رہتے وقت وہ اپنے سارے ڈر بھلا دیتی، لیکن ایک دن گھر کی دیوار کے دوسری طرف جس دیوار کے روشندان پر وہ اشفاق کی آنکھیں دیکھتی تھی، اس نے ماتمی شور برپا ہوتے سنا۔ اسی وقت محبوب علی سقہ کی بیوی باہر کے دروازے کا پردہ ہٹا کر آنگن میں داخل ہوئی اور چھاتی پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔۔

"اشفاق میاں ٹرک کے نیچے آگئے، بھیجا زمین پر نکل آیا۔۔"

شوکت اچھل سی پڑی، اسے ایک پل کو ایسا لگا جیسے اس کی پیٹھ پر چپکی ہوئی خوف کی گھناؤنی چھپکلی ایک جھٹکے سے اچھل کر دور جا گری ہو۔ اس روز شوکت قدرت اللہ سے لپٹ کر ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہنا چاہتی تھی۔

"بھیا قبرستان جانا تو اشفاق کی قبر پر تھوک ضرور آنا۔"

انھیں دنوں پرتاپ بھی شوکت کے باپ سے اجازت لے کر شوکت کو پارٹی کے چھوٹے موٹے کاموں میں دیگر عورتوں کے ساتھ الجھا دیا کرتا۔ تھوڑے دنوں بعد جب کسی جلسے جلوس کے موقع پر شوکت کو ریشمی کپڑے کا رنگین ربن لگا بلا جمپر پر کندھے سے ذرا نیچے کٹیا سے

ٹانکنے کے لئے دیا جاتا تو بلا لگا کر لوگوں کے درمیان گھومنے پھرنے میں اسے اپنی امتیازی حیثیت کا احساس ہوتا اور وہ سوچتی ایسے موقعے بار بار اور جلدی جلدی آتے رہنا چاہئے۔

لیکن ابھی پچھلے دو چار مہینے سے شوکت کو پھر ایسا لگنے لگا تھا جیسے پیٹھ پر ٹھیک اس پرانی جگہ کوئی موٹی سی چھپکلی اپنے پنجے گڑا رہی ہے۔ پرتاپ اسے فارم ہاؤس میں پھولوں کی نرسری دکھانے لے گیا تھا۔ وہاں اپنے کمرے میں بیر کی بوتل کھلوائی تھی اسے استعمال کے لئے ملازم نے ایک کے بجائے دو گلاس دھو کر رکھے تھے۔ قریب ہی پرتاپ کا نرم گدوں والا کشادہ بستر بھی بچھا تھا اور کھڑکیوں پر دبیز پردوں نے شیشوں کو پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ شوکت اس کمرے میں نہیں رکی۔ جتنی دیر پرتاپ شغل کرتا رہا، شوکت پھولوں کے پودوں کو دیکھتی رہی اور مالی کے بال بچوں کے بیچ مونڈھا ڈال کر تازہ تازہ مٹھا پیتی رہی۔

شوکت نے سوچا تھا کہ وہ گھر جا کر فون پر پرتاپ کو گالی ضرور دے گی۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد شوکت کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پرتاپ کے لئے اس سے بڑی خوشی کی اور کوئی بات نہ تھی کہ شوکت اسے گالی دے۔ ایک بار نہیں بار بار۔ کل دوسری پرسوں تیسری تاکہ شوکت جہاں پرتاپ کی ضرورت کے مطابق بے شرم اور بے حیا بن سکے۔

انھیں دنوں جب وہ کسی موقعے پر اپنی مرحوم عائشہ باجی کے شوہر شہباز میاں سے ملی تھی تو انھوں نے شوکت سے اپنائیت کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کی تھیں جن میں قیمتی اشارے بھی شامل تھے۔

''میری بیوی اکثر کہتی تھی۔'' شہباز اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ ''عورت کو ہر لمحہ اپنے عورت پن کی تلاش مین رہنا چاہئے''

پھر انھوں نے سیدھا شوکت سے مخاطبہ جوڑا تھا۔

''تم بھی مکالمہ کرتی ہو؟''

''کس سے۔۔۔ ؟'' شوکت نے سوال کیا تھا۔

''خود سے'' شوکت کچھ نہ بولی۔ ''اپنے آپ سے مکالمہ'' کم سے کم ہفتے میں ایک بار۔۔۔ بس تھوڑے سے سوال جواب''

''کس چیز کے بارے میں۔ ؟''

''خود اپنے بارے میں۔ اگر کچھ کیا ہے تو کیوں کیا ہے ؟ نہ کرتیں تو کیا ہوتا ؟ ایسا کیا کچھ

کرنا پڑتا ہے جس کے کرنے میں روشنی کی نہیں اندھیرے کی ضرورت پڑتی ہے ۔۔۔ ؟ ایسے ہی بہت سے سوال ۔۔۔ پھر ان کے جوابوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی ساتھ ہی ساتھ قائم رکھنا چاہیے۔"

شوکت کو خبر نہ تھی کہ اس طرح کا مکالمہ اس کی سوتیلی ماں اکبری بیگم بھی گھر سے نکلنے سے پہلے اپنی بغلوں میں ولایتی سینٹ کی پھوار ڈالتے ہوئے اکثر اپنے آپ سے کر لیا کرتی تھیں۔

شوکت کی سوتیلی ماں اکبری بیگم لڑکیوں کے مڈل اسکول میں استانی تھی۔ گھر کی جلاؤ لکڑیاں وہ شوکت کے والد کی ٹال سے خریدنے آیا کرتی۔ تب اس کا بائیس تیئیس کا سن تھا اور مدرسی کے پیشے کی قلیل آمدنی سے پریشان تھی۔ انھیں دنوں کچھ ایسا ہوا کہ وہ شوکت کے باپ کو دیکھ کر کچھ زیادہ ہی مسکرانے لگی۔ تب تک باپ رنڈوے ہو چکے تھے اور مسکراہٹوں کی ہی تلاش میں تھے۔ انھوں نے اکبری بیگم کو مشورہ دیا کہ وہ تھوک بھاؤ میں ان سے جلاؤ لکڑیاں لے جایا کرے اور پھٹکر بھاؤ میں انھیں بیچا کرے۔ اکبری بیگم نے اپنے دروازے کے سامنے نگر نگم کو کھلا پلا کر ایک چھوٹا سا سائبان ڈال لیا تھا اور لکڑیاں بیچنے لگی پھر تو شوکت کے باپ کی ٹال پر ان کی گدی کے پاس موںڈھا ڈالے اکبری کو اکثر بیٹھا پایا جانے لگا۔ بس انھیں دنوں میں سے ایک صبح اکبری کے بدن پر مہکتے پھولوں کے گہنے شوکت کے باپ کے بستر پر مسلے پڑے تھے اور وہ ان کے نکاح میں آچکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے برس آندھی طوفان کی طرح گذر چکے تھے جس میں اکبری بیگم کی بیوگی کے پانچ سال بھی شامل تھے۔ حالانکہ شوہر کے مرنے کے تین مہینے بعد ہی سے اکبری کی بیوگی کے نشانات اس کے حلیے اور چہرے مہرے سے غائب ہو چکے تھے، لیکن اب تو اس کی چھل بل ہی کچھ اور تھی۔ جب بھی وہ دن بھر کے بعد گھر میں داخل ہوتی، سب سے پہلے اپنے کندھے پر لٹکنے والے پرس کو دیوار کی الماری میں بند کر کے تالا لگاتی۔ کئی بار شوکت جہاں کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ وہ کبھی ماں کی نظریں بچا کر اس پرس کی تلاشی لے کر دیکھے۔ لیکن شوکت کو اس کا کبھی موقع نہ ملا۔ مگر ایک دن شوکت جب ماں کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ میز پر ماں کا پرس رکھا ہے۔ لیکن ماں تو کچھ دیر پہلے ہی اپنے روزمرہ کے مطابق گھر سے نکل چکی تھی۔ شوکت سمجھ گئی کہ جلدی میں وہ پرس میز پر ہی بھول کر چلی گئی ہے۔ شوکت پہلے تو بھاگ

کر گھر کے صدر دروازے پر گئی۔ باہر ادھر ادھر جھانک کر دیکھا۔ پھر جلدی سے دروازہ بند کر کے اور اندر سے کنڈی لگا کر واپس ماں کے کمرے میں آئی۔ دھیرے سے پرس کو کھولا اور احتیاط سے اندر کا جائزہ لینے لگی۔ سب سے پہلے ایک چھوٹی سی ڈائری اس کے ہاتھ لگی۔ ڈائری میں معروف لوگوں اور پولیس کے کچھ حکام وغیرہ کے فون نمبر تھے اور ڈائری کے پلاسٹک فلیپ کے اندر آدھی پھنسی پاسپورٹ سائز کی کسی موچھوں والے مرد کی تصویر جھانک رہی تھی۔ ڈائری بند کر کے اس نے پھر ہاتھ ڈالا۔ دیکھا چھوٹے سے پرس میں چند روپئے تڑے مڑے رکھے تھے۔ پھر اس کو لپ اسٹک، شیشہ اور دستی وغیرہ کے علاوہ اس میں سرکاری اسپتال میں تقسیم کئے جانے والے نرودھ کے دو پیکٹ بھی دکھائی دئے اس کے ساتھ ربن بینڈ میں بندھے کچھ ملاقاتی کارڈ بھی رکھے تھے۔ جن میں زیادہ تر پولیس افسران اور ہوٹل کے پروپرائٹروں کے کارڈ تھے۔ شوکت کو پرس باہر سے ہی کچھ پھولا پھولا لگ رہا تھا اس لئے شوکت نے پرس کے باہری خانے کی زپ بھی کھولی جو غالباً کافی کھینچ تان کے بعد مشکل سے بند ہو پائی تھی۔ زپ کھلی تو اس خانے سے ایک شیشی نکلی جس میں پانی کی رنگت کا کوئی مشروب تھا۔ شیشی سیل بند تھی اور اس کے لیبل پر کسی ڈرائی جن کا نام لکھا ہوا تھا ساتھ ہی کنٹونمنٹ ایریا کی آرمی کینٹین کی رسید بھی رکھی تھی جو کسی کیپٹن کے نام کی تھی۔ اس کے علاوہ دو ایک سنیما گھروں کی بالکونی درجے کے لال پیلے ٹکٹوں والے کاونٹر فوائل بھی پڑے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹے سے پرچے پر کسی ٹھاکر نام کے سب انسپکٹر کا نام، اس کے موجودہ تھانے اور وہاں چارج لینے کی تاریخ وغیرہ کے ساتھ کسی نئے تھانے پر مطلوب تقرر کی تفصیلات درج تھیں، شوکت نے جلدی جلدی سب چیزوں کو ویسے ہی واپس پرس میں رکھ دیا اور بند کر کے پھر ٹھیک اس جگہ رکھ کر ماں کے کمرے سے باہر آئی تھی کہ باہر کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ ان دنوں کال بیل کام نہیں کر رہی تھی، کیونکہ بجلی کے پچھلے دو بلوں کے بقایا کی ادائیگی کے نوٹس پر بھی رقم نہ جمع کئے جانے کے سبب کنکشن کاٹ دیا گیا تھا۔ شوکت نے باہر کا دروازہ کھولا تو دیکھا ماں ہے۔ وہ تیر کی طرح اندر آئی اور سیدھے اپنے کمرے میں پہنچی۔ اپنے پرس کو تشویش کے ساتھ کھول کر ایک نظر دیکھا، پھر کندھے پر لٹکا کر الٹے پیروں واپس چلی گئی۔

دھیرے دھیرے شوکت نے یہ بھی دیکھا کہ ماں دو دو تین تین دن گھر سے غائب رہنے لگی۔ ایک دن بیٹی نے ماں سے مکالمے کی شروعات کی۔

''ماں۔۔۔ تم کہاں چلی جایا کرتی ہو؟''

"تمھارا باپ کہاں چلا جایا کرتا تھا؟ کیا کبھی مجھ کو یا تم کو بتاتا تھا؟"

جواب ملا۔

کچھ دن بعد شوکت نے پھر مکالمہ شروع کیا۔

"ماں محلے والے اب بہت باتیں کرنے لگے ہیں۔"

"جب تم اشفاق سے سینما گھروں میں ملتی تھیں تب محلے والوں کا خیال آیا تھا تم کو۔؟"

شوکت کو جواب ملا۔

"ماں تمھارے پاس پولیس والوں کے اتنے فون کیوں آتے ہیں۔؟"

"میں تو تم سے کبھی نہیں پوچھتی کہ پرتاپ شکلا تمھیں کیوں فون کیا کرتا ہے۔" شوکت کو جواب ملا تھا۔

پھر شوکت کو معلوم ہو گیا کہ اس کی ماں بڑے بڑے حکام کے عشرت کدوں کی زینت بن رہی ہے۔ وہ پولیس کی مخبری بھی کرتی ہے اور اعلیٰ حکام اور ان کے ماتحتوں کے درمیان رشوت کے لین دین میں دلالی کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ ڈھلتی عمر میں ہونے کے باوجود کمرہ بند کر کے ایک گھنٹہ ورزش کرتی ہے، جسم کو متناسب اور وزن کو قابو میں رکھتی ہے۔ اناج چھوڑ کر ایک وقت صرف سلاد کھاتی ہے اور ہر آٹھویں دن کسی بیوٹی پارلر میں پانچ گھنٹے کا مسلسل وقفہ اپنے چہرے مہرے کی زیبائش کے لئے گذارتی ہے پھر وقت بھی کہاں تھا۔؟ ماں بیٹی کے درمیان سارے مکالمے ختم ہو چکے تھے۔

ممو خاں کے چہرے پر ان کی مونچھیں ایسی بہار دیتی تھیں کہ دیکھنے والا پلٹ پلٹ کر اور گھوم گھوم کر دیکھتا تھا۔ بالوں کی موٹائی، چمک اور شادابی کے ساتھ ان کی اینٹھن میں جو بانکپن تھا ممکن ہے وہ آصف الدولہ کی مونچھوں میں رہا ہو۔ جب انھوں نے آموں کا نیا باغ لگوایا تو ایک پڑوسی باغبان راحت میاں نے ان کے اس باغ کا پانی کئی بار چوری سے کاٹ کر اپنے نئے باغ میں لگوالیا۔ ممو خاں کو پتہ لگا تو ایک دن وہ بڑے آرام سے شام کو سفید اور بے داغ شیروانی پہن کر اور اس کے آٹھوں بٹن بند کر کے اور گلے کا تکمہ بھی اچھی طرح لگا کر ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی گھماتے راحت کے گھر بڑی بے نیازی کے ساتھ پہنچ گئے۔ میزبان کے ساتھ حقہ پیا اور اس کی بیوی

کی گٹھیا کی پرانی بیماری کے علاج کے لئے اپنا خاندانی تیر بہ ہدف نسخہ بھی بنوا کر وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ راحت میاں کو خلوص سے دوا پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"بھابھی جان کو اس دوا کی تیس پڑیاں بنا کر کھلائیے۔ ایک ماہ میں ہی انشاء اللہ خاطر خواہ شفا ہوگی۔"

لیکن جب راحت میاں ممو خاں کی اس نیک دلی پر تشکر کے کلمات ادا کر رہے تھے تو اس وقت ممو خاں انگلیوں کی پوروں پر بیس بار گن کر اپنے دل ہی دل میں یہ جملہ دہرا رہے تھے۔

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

"میں۔۔۔"

"۔۔۔پانی کاٹا تھا"

اگلے سال جب ممو خاں راحت میاں کے نواسے کے عقیقے کی تقریب میں گئے تو بچے کے لئے جوتے موزے اور بنیان وغیرہ کے ساتھ مکمل جوڑا پورے تکلفات کے ساتھ خوان پوش میں سجا کر پہنچایا اور بڑے تپاک سے پڑوسی باغبان کے ہاتھ سے پیش کئے گئے پان اور الائچی سے منہ لال کیا۔ لیکن اس وقت بھی انھوں نے انگلیوں کی پوروں پر گن گن کر دل ہی دل میں دہرایا۔

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

ایک آدھ سال اور گذر گیا تو ممو خاں کو کسی موقع پر ایک بار ایسا لگا کہ جو جملہ وہ بیس بار دل ہی دل میں دہرایا کرتے ہیں، اس کی قوت کو وقت غالباً کچھ کمزور کرنے لگا ہے تو انھوں نے آئندہ اس جملے کو اس طرح دہرانا شروع کر دیا۔

"قرآن قسم میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

پھر یہ ہوا کہ سات آٹھ سال میں پڑوسی باغبان کا وہ باغ جسے اس نے کئی بار ممو خاں کا پانی چرا کر سینچا تھا، جب اپنی پہلی فصل کے بوجھ سے مستا رہا تھا تو ممو خاں نے اسی طرح سے سوچا جیسا کہ ان کے خیال میں آم کی باغبانی کرنے والے کو سوچنا چاہئے اور اسی طریقہ سے سات سال پہلے اپنے دل پر لگی چوٹ کو جھاڑ پونچھ کر باہر نکالا، جو ان کے خیال میں آم کو اپنا کلیجہ نکال کر چاشنی فراہم کرنے والی تہذیب کو کرنا چاہئے۔ وہ غصے میں اکثر کہتے تھے۔

"صبر اور انتظار کے معاملے میں حضرت ایوب کی قسم آم کے باغبان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" لہٰذا ان کی پرانی چوٹ نے سب سے پہلے یہ کیا کہ بڑی رازداری کے ساتھ آم کی منڈی کے آڑھتیوں اور تھوک خریداروں میں اپنے شاندار باغ کے آم کی پوری فصل مفت تقسیم کر دی اور ان کی یونین کو نقد پانچ ہزار روپے بھی چندے کے طور پر دیا اور آخر میں ان کے مکھیاؤں کو ولایتی دارو فراہم کروائی۔ جب راحت میاں اس باغ کی فصل ٹرک میں بھر کر منڈی پہنچے تو سارا دن بھاؤ بٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن منڈی کے تھوک بیوپاری ایک ٹرک ریت کا دام بھی لگانے کو تیار نہ ہوئے۔ ٹرک واپس لوٹ گیا۔

دوسرے دن ٹرک پھر منڈی لایا گیا، اب دام ایک ٹرک مٹی بھر کے بھی نہیں رہ گئے۔

تیسرے دن جب مال پھر آیا تو داغ لگنا شروع ہو چکا تھا۔ آڑھتیوں نے ایسے دام لگائے جیسے بھیک دے رہے ہوں۔

راحت باغبان کو اپنے مال کی یہ ہتک دیکھ کر غصہ آ گیا۔ دیر تک وہ کانپتے رہے۔ انھیں ٹھنڈا فالودہ پلایا گیا تو دل ذرا ٹھہرا۔

"گائے بیل کو کھلا دونگا لیکن اب نہ بیچوں گا۔" انھوں نے ایسی آواز میں یہ جملہ ادا کیا کہ آسمان دہل گیا۔

تھوڑی دیر بعد منڈی کی بھیڑ نے دیکھا ایک ٹرک سے آم لٹائے جا رہے ہیں اور سڑک پر گھومتی پھرتی آوارہ گائیں اور سانڈ ان پر جھکے ہوئے ہیں۔

ایک دن حقہ پیتے میں شفق رنگ شام کے حسن کے درمیان جسم کو بھلی لگنے والی مند مند ہواؤں کے جھکولوں کے ساتھ کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے راحت باغبان، منڈی کے کسی آڑھتیے سے پوچھ رہے تھے۔

"بھائی رام کھلاون جی۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آج بھی سوچتا ہوں تو دماغ کام نہیں کرتا۔ اس دن آخر منڈی والوں نے میرے اس مال کو نہ خریدنے کا دل میں فیصلہ کیوں کر لیا تھا۔؟"

"کیا آپ کو اس بات کا دکھ ہے ؟۔" آڑھتیے رام کھلاون نے پوچھا تھا۔

"اتنا ہی جتنا میری بہو بیٹیوں کو سر بازار رسوا کیے جانے پر ہو سکتا ہے۔"

"آپ کو ان آموں سے اتنی محبت تھی؟"

"ہاں، وہ دودھ اور شہد سے تیار کی گئی میرے سب سے دلارے باغ کی پہلی فصل تھی۔" راحت میاں تڑپ کر بولے۔

"بھائی صاحب۔" رام کھلاون نظریں جھکا کر بولا "آپ کو پتہ ہو گا کہ آپ کے آدمیوں نے کئی بار ممو خاں کا پانی کاٹ کر اس باغ کو چوری سے سینچا تھا۔" راحت میاں کا منہ دو پل کے لئے کھلا رہ گیا تھا اور پھر انھوں نے حقے کا اتنا لمبا اور بھرپور کش لیا کہ کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ آنکھیں باہر نکل پڑیں، منہ بیر بہوٹی ہو گیا۔ وہ پھر اپنی سانس کو باوجود کئی ہچکیوں کے واپس نہ لا پائے۔ صرف اس شرمندگی میں کہ وہ صبر اور انتظار میں ممو خاں سے مات کھا گئے تھے۔ راحت کی دونوں آنکھیں کھلی تھیں لیکن اس شفق رنگ شام پر تیزی سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ممو خاں نے دشمنی کی قلم لگانی بھی آم کی قلمیں لگانے سے ہی سیکھی تھی۔ شاخ کو پہلے تیز چاقو سے صفائی سے ترچھا کاٹو، پھر قلم کے ایک ایک ریشے کو دوسرے ریشوں سے جوڑ کر باندھو۔

ممو خاں کے باغات کئی تھے۔ زمینوں پر کاشت تھی، ٹریکٹر تھے۔ ایک کان میں ننھی سی بالی ڈالے گانجے کی چلم گھسیٹنے والے چوڑی اور مظبوط چھاتی کے وہ پاسی جن کے پردادا بیگم حضرت محل کے ساتھ کسی زمانے میں اودھ کی سرزمین پر انگریزوں سے لڑے تھے۔ ممو خاں کی گنے کی CASHCROP کی نگہہ داشت کرتے تھے اور ممو خاں کے لئے ہر دم اپنی جان ہتھیلی پر لئے رہتے تھے۔ ایک بار ممو خاں کے تین جانباز پاسیوں کی بیٹیوں کی شادیوں کا معاملہ آن پھنسا۔ ممو خاں نے ان لڑکیوں کے جہیز کے انتظام کا وعدہ کر لیا تھا۔ باغوں میں ابھی صرف بور آئے تھے۔ فصل بک گئی ہوتی تو وہ بادشاہ ہوتے۔ کعبے کی طرف منھ کر کے بولے۔

"میرے مالک میں جانتا ہوں کہ آم کے پیڑوں کے بور دکھا کر فصل کا سودا کرنا ہمارے لئے حرام کام برابر ہے۔ لیکن تو میری مجبوری کو معاف کرنا کہ مجھے تین تین کنواریوں کے ہاتھ پیلے کرانے ہیں۔ اور میرا تین لاکھ روپیہ دساور میں پھنسا پڑا ہے۔" پھر ممو خاں نے ایسے بیوپاریوں کو فون کیا جو صرف پیڑوں پر بور دیکھ کر فصل کا سودا کر کے جوا کھیلتے تھے۔ ایک باغ کی فصل اونے پونے ہی بکی۔ ممو خاں نے ان پاسیوں کی تینوں بیٹیوں کا جہیز بیل گاڑیوں پر لدوا کر پہنچوا دیا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا باپ رات بھر ممو خاں کے پیر دباتا رہا اور روتا رہا۔ ممو خاں نے ڈانٹ لگائی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"رو لینے دو مالک، نہیں تو مارے خوشی کے میرے پران نکل جائیں گے۔"

ایک دن شطرنج بچھی تھی، ادھر ممو خاں اور ادھر علاقے کے تحصیلدار راٹھور جی ڈٹے تھے۔ راٹھور جی کو زندگی میں صرف دو ہی چیزوں کا شوق تھا، ایک تو مسلمانوں کے گھروں کے شامی کباب جنھیں وہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ پیاز کے لچھوں کے ساتھ کھا جایا کرتے تھے اور دوسرے شطرنج۔ شطرنج بھی اس حد تک جب تک وہ مقابل کو مات دیتے رہتے۔ مات کھا جاتے تو ان کی ٹھکرائی انھیں دیوانہ کر دیتی۔ وہ بساط پھاڑ دیتے اور مہرے جلتی ہوئی چلم میں ڈال دیتے۔ راٹھور جی کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ پوری طرح ترو تازہ تھا۔ شاید اسی لئے انھیں سنسنی خیزی اور اخباروں کے اسکینڈلوں میں اتنا مزہ آتا کہ وہ دو دو تین تین دن تک ان اسکینڈلوں کو بار بار بیان کر کے ممو خاں کا دماغ چاٹ جایا کرتے۔ اس وقت راٹھور کے چہرے کی چمک آنکھوں کا تحیّر اور اندر کی بے چینی اور پھڑ پھڑاہٹ چہرے پر کچھ اس طرح عیاں ہوتی کہ دیکھنے والے کو بھی لطف آجاتا۔ وہ عموماً چارپائی پر بیٹھتے تھے، لیکن ان باتوں کے دوران جوش میں چارپائی پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور چھت کا پنکھا ان کے سر سے آدھا ہاتھ اوپر رہ جاتا۔

ایک بار ممو خاں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کسی سنسنی خیز جواب کی امید میں وہ پوچھ بیٹھے۔

"جب شطرنج نہیں کھیلتے تو وقت کیسے کاٹتے ہو۔۔۔؟"

ممو خاں کچھ دیر منھ لٹکائے سوچتے رہے پھر، کچھ ایسا شرمائے جیسے سولہ برس کی لڑکی شرماتی ہے۔ پھر انھوں نے دھیرے سے کہا۔

"کیا بتاؤں؟ کئی بار سوچا کہ تمھیں بتا دوں لیکن ہمت نہ ہوئی۔"

"کیوں۔۔۔؟ بھلا ایسی کیا بات ہے؟" راٹھور چونکے۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے، بلکہ اب وہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔۔"

"اچھا۔۔۔؟" راٹھور ایسے چلائے اور اچک کر چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گئے جیسے ان کی مرادوں کی کلی کھلنے والی ہے۔

"تم میرے اچھے دوست ہو۔" ممو خاں دھیمے لہجے میں گردن جھکائے بولے۔ "سوچتا

ہوں بتادوں، پر ناراض نہ ہونا۔"

"بالکل نہیں۔' راٹھور نے جلدی سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بے دھڑک بتاؤ۔"

ممو خاں نے کمرے کے ادھر ادھر دیکھا۔ بار بار لفظ تلاش کرنے اور انھیں ادا کرنے کے لئے ان کے ہونٹوں میں کپکپاہٹ ہوئی، آخر کو وہ بڑی مشکل سے کہہ پائے۔

"جب سے استادگی میں کچھ کمی آئی ہے تب سے مجھ میں ایک شرم ناک شوق پیدا ہو گیا ہے۔"

"کیسا شوق۔۔؟" راٹھور کی سانس جیسے رک گئی۔

"میں اپنا زیادہ وقت بس لگاتار دیکھتے رہنے میں بسر کرنے لگا ہوں۔"

"کیا دیکھتے رہنے میں؟" راٹھور کی دونوں آنکھیں باہر نکلنے کی تیاری میں تھیں۔

"گینگ ریپ GANG RAPE۔"

"گینگ ریپ؟ کیا بکتے ہو۔۔" راٹھور چارپائی پر کھڑے ہو گئے۔

"یقین مانو ایسی لذت ملتی ہے کہ جوانی میں ہم بستری میں بھی نہ ملی تھی۔"

"لیکن گینگ ریپ تمھیں دیکھنے کو مل کیسے جاتا ہے۔ یہ کہاں ہوتا ہے؟ تجھے میری قسم۔" اب راٹھور کانپ رہے تھے۔

"خوب ہوتا ہے۔۔" ممو خاں کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ "پہلے بہت دنوں تک سوشلزم کا گینگ ریپ ہوتے دیکھتا رہا۔ پھر فلاحی ریاست WELFARE STATE کا دیکھا آج کل دھرم نرپیکشتا۔۔۔"

راٹھور کی ساری ہوا نکل چکی تھی۔ وہ ممو خاں کی بات کاٹ کر چلائے۔۔۔

"تم ایک نمبر کے حرامی ہو۔۔" راٹھور یہ کہتے ہوئے چارپائی سے اترے پھر انھوں نے بساط کے مہرے الٹے اور باہر نکل گئے۔

(۸)

فرقہ پرست ہندو جماعت کے ہندی اخبار میں پارٹی کے نظریوں کی تشہیر کے سلسلے میں مضامین اور تحریریں چھپتی رہتی تھیں۔ قدرت اللہ سے کہا گیا کہ وہ ان مضامین کا ترجمہ پارٹی کے اردو ترجمان میں بھی کم سے کم ہفتے میں ایک بار دیتا رہے تاکہ عام مسلمانوں کو صحیح نقطۂ نظر کے بارے

میں معلومات ہو سکیں اور ان کے دلوں میں صدیوں سے چلی آ رہی منافرت اور علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کیا جا سکے۔ قدرت اللہ غریب اس کام میں لگ گیا۔ اگلے ہی ہفتے اس نے اردو پڑھنے والوں کو سب سے پہلے جو بتایا وہ کچھ اس طرح تھا۔۔۔

بھارت اس لئے سیکیولر ہے کہ وہ ایک ہندو راشٹر ہے

اور HINDUTVA نام ہی ہے

رواداری

فیاض دلی

اور فکر و نظر کی کشادگی کا

یہ مذہب نہیں، ایک نظام حیات ہے جو الگ راستوں پر چل کر ایک ایشور تک پہونچنے پر یقین رکھتا ہے۔

جب تک بھارت کا مسلمان اپنے مذہب میں بھارت کے قدیم مذہب کو اور اپنی تہذیب میں بھارت کی قدیم تہذیب کو مدغم نہیں کرے گا، لڑائی جاری رہے گی۔

کہ ہندو ہی آغاز ہے

اور ہندو ہی انجام

کچھ لوگوں میں اخبار کی اس تحریر پر کچھ چیں چپڑ ہوئی۔ کبھی اخبار کھولا گیا۔ کبھی بند کیا گیا کبھی یہ سطر پڑھی گئی کبھی وہ۔۔ کوئی اچھلا۔۔۔

"اجی صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہندو ہو جاؤ۔"

امتابھ بچن کی فلم کا ٹکٹ لینے والی لائن میں لگی مسلمان برقعہ پوش عورتوں کو آج بھی کچھ پتہ نہیں تھا غالباً انھیں یقین تھا کہ وہ یہ سب پتہ لگائے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہیں کیونکہ قدرت اللہ نے اپنی آنکھوں سے ایک آدھ بار اس اخبار سے انھیں بچوں کی صرف غلاظت ہی صاف کرتے دیکھا تھا۔۔ مگر قدرت اللہ کی بھی مجبوری تھی ایک ہفتہ گیا نہیں کہ دوسرا آگیا۔ اخبار پریس میں جانا تھا اس نے پھر ترجمہ کیا۔۔۔

سخت دل مسلم بادشاہوں نے ہمارے دریاؤں، ہمارے میدانوں اور ہماری بستیوں پر

حملہ نہیں کیا تھا۔ یہ سب تو معمولی چیزیں تھیں اصل گھاؤ تو انھوں نے تاک کر وہاں لگایا جہاں ہم بلبلا اٹھے۔ اور وہ تھا ہمارے سینکڑوں ہزاروں سال پرانے HINDUTVA کا قومی سبھاؤ۔

انھوں نے اپنی بربریت سے ہمارے اس بیش بہا سبھاؤ کو تہس نہس کرنے کی کوشش کی۔ اس سازش میں برطانیہ کے مورخوں نے برابر کا ساتھ دیا۔ انگریز نے بڑی چالاکی سے ہمیں غلط مغربی علوم کی انجان پگڈنڈیوں پر ہانک دیا۔ ہمیں بتلایا گیا۔۔۔

سارا بھارتیہ گیان لنگڑا ہے

ادھورا اور فرسودہ ہے

علم و آگہی کا نیا سورج مغرب سے طلوع ہو چکا ہے

بھارت ایک جغرافیائی علاقے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس علاقے میں مختلف گروہ اور سماج شامل ہیں۔

جن کا اپنا اپنا مذہب اور اپنی اپنی تہذیب ہے۔

اس جھوٹی اور بدیسی دھرم نرپیکشتا نے بھارت کے ہزاروں سال پرانے راشٹریہ سبھاؤ کی اصلی ایکتا اور اکھنڈتا کو دفن کر کے فرقہ پرستی، تشدد اور الگاؤ کی بنیاد ڈالی اور وندے ماترم گانے والوں کی آنکھوں کے سامنے بڑی بے رحمی سے ماں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

ہم بہت لڑے نہرو سے۔

بار بار ہم نے کہا کہ مہاراناپرتاپ اور شیواجی کے بھاگوت دھوج یعنی کیسریا جھنڈے کو راشٹریہ جھنڈا بنا دیا جائے کیوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اس میں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی۔ بدیسی اور جھوٹے علم کی انجان پگڈنڈیوں پر دور تک نکل جانے والے ضدی نہرو نہیں مانے اور اپنا جھنڈا اونچا رکھا۔

ہم کتنی بار ذلیل ہو چکے! کتنی کتنی بار!

اب اور کتنی بار ذلیل ہوں گے؟

یہ بات جو ذلیل کر رہا ہے اس کے سوچنے کی نہیں، جو ذلیل ہو رہا ہے اس کے سوچنے کی ہے۔

اس لئے۔۔۔

گرو سے کہو ہم ہندو ہیں۔۔۔

کچھ لوگوں میں اخبار کی اس تحریر پر کچھ چیں پیں چیں پیں ہوئیں۔ کبھی اخبار کھولا گیا کبھی بند کیا گیا، کبھی یہ سطر پڑھی گئی کبھی وہ۔۔۔ کوئی اُچھلا۔

"اجی یہ وہی تو ہیں جنھوں نے گاندھی کو گولی ماری تھی۔۔۔"

نہ تو پیر صاحب کے عرس پر لگنے والے میلے میں بھیجے کی کلیجی کے ٹکڑوں کو سیخوں میں پیوست کر کے انھیں کوئلوں پر سینک کر بیچنے والے کو اور نہ میلے کی بھیڑ میں لونڈیوں کے پیچھے آوازے کستے، گلے میں لال رومال باندھے اور بالوں میں سستا خوشبودار تیل چپڑے مسلمان لونڈوں کو ہی اس بات کا پتہ تھا کہ کون کس کو ذلیل کر رہا ہے۔ قدرت اللہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے اخبار کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھاڑ کر کلیجی والا اس میں بھنی کلیجی اور چٹنی رکھ کر گاہکوں کو بیچ رہا تھا۔ مگر قدرت اللہ کی بھی مجبوری تھی۔ اخبار پریس میں جانا تھا اس نے پھر لکھا۔۔۔ چیں! چیں!! پھر لکھا پیں! پیں!!

(۹)

خانساماں کچن میں تھا، کتے غنودگی کی حالت میں ست پڑے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مجو میاں نے سامنے کھڑے ہو کر انگور کی بیلوں میں بکروں کا خون مالی سے ڈلوایا تھا۔ رات پچاس لوگوں کا کھانا تھا موخاں نے باغ سے جس ادھے پر لنگڑا بھیجا گیا تھا اس کے بیل پچھواڑے سائبان کے نیچے آرام سے جگالی کر رہے تھے۔ کوٹھی کی شاندار بیٹھک سے ملحق چھوٹے کمرے میں جس کا سارا فرنیچر اعلیٰ قسم کے بید کا تھا اور جس پر باریک چڑے کی گوٹوں والے آرام دہ گدے لگے تھے، ان گدوں پر آنسو بہاتی شوکت جہاں بیٹھی تھی اور اسے اپنا رومال دیتا ہوا شہباز خاں۔۔۔ یوں تو شہباز خاں بہت کچھ پہلے سے جانتا تھا لیکن اس وقت وہ چپ چاپ سب کچھ شوکت جہاں سے سن رہا تھا۔ شوکت جہاں، باپ کی دلاری، بی اے میں فرسٹ ڈویژن، جوڈو کراٹے کی مشقوں میں انعام یافتہ لمبی اور اونچی اڑانوں کی شوقین، شہباز سے یوں مخاطب تھی۔

"میں نے سنا تھا، دیکھا نہیں تھا کہ جب نہرو جی ہمارے محلے میں علما کے جلسے میں آتے اور میری بوڑھی نانی چھت پر عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر انھیں سڑک سے گزرتے دیکھتیں تو پھولوں کی بارش کرتیں اور دونوں ہاتھوں سے بلائیں لیتیں اور کہتیں میرا لعل آگیا، میرا

لعل۔۔۔ باپ کو میں نے سیاست کے لئے سب کچھ ہی کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میرا بھی کچھ کرنے کا دل چاہا۔ پرتاپ شکلا کو میرے باپ نے کچھ زمین دلوانے میں بڑی مدد کی تھی۔ تب او قاف میں اس کی کوئی بات پھنسی تھی۔ میرے گھر کے جب تب چکر لگاتا تھا۔ میں انٹر میجیٹ میں پڑھتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہنسی ہنسی میں مجھ سے کہتا۔ "بے بی آپ پارٹی کا کام کرے۔۔ نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ انھیں آگے آنا چاہئے" باپ مرا تو پتہ چلا کہ ہمارا ایک گھر بھی ہے۔ اس کی دال روٹی کیسے چلتی ہے، یہ تو ہم نے کبھی نہ جانا۔ قدرت ہماری سوتیلی ماں سے تھا۔ سوتیلی ماں نے مجھے اپنی گود تو دی لیکن دھیرے دھیرے سب ہتھیا بھی لیا۔ قدرت تو گھر سے ہمیشہ کے لئے چلا جاتا کہ ماں بس اپنی رنگ رلیوں میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ میرے باپ کو جوتی کی نوک پر رکھتی۔ باپ کے مرنے کے بعد ایک بار کسی بڑے ہوٹل کے کمرے میں اُسے کسی مالدار سندھی صنعت کار کے ساتھ۔۔ قدرت نے تو سنکھیا کھالی تھی۔ اسپتال میں پیٹ صاف کیا گیا اور معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع کیا گیا۔ ۲۵ سال کی عمر ہونے کو آرہی ہے۔ دس سال سے مردوں کی نظریں دیکھ رہی ہوں مرد کن کن پینتروں سے، کون کون سے حیلوں سے اور کیسے کیسے بہانوں سے خود کو عورت کے پاس لاتا ہے۔ کیسی کیسی سبک اور میٹھی آوازوں میں اور کیسے کیسے جادوئی لہجوں میں اور کتنی پر پیچ شیریں سریلی اور کہاں سے کہاں پہنچا دینے والی زبان میں عورت سے بولتا ہے اور کتنی چالاکی ہوشیاری سے پراسرار اور پر اثر لفظوں کو اپنی آنکھوں کے پرکشش کاغذ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر جلی حرفوں میں لکھ کر انھیں عورت کی آنکھوں کے راستے پہونچا کر اس کے احساس کے دروازوں کو تھپکیاں دیتا ہے اور ہولے ہولے پکارتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ صبح ہو کہ دوپہر، شام ہو کہ رات، خلوت ہو کہ جلوت، وہ تھپکیاں، وہ مند مند گرم گرم اندر کہیں جھرجھری سی پیدا کر دینے والی اور دھڑکنوں تک میں سرایت کر جانے والی وہ پکاریں عورت کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ پھر وہ سرگوشیاں، وہ آوازیں، وہ پکاریں ایک دن عورت کو زیر کر دیتی ہیں اور آخر کار چیخ چیخ کر بھدے، کرخت، ذلت آمیز اور تمسخرانہ انداز میں اعلان کرتی ہیں۔ "ہم نہ کہتے تھے، اس کم عقل جنس گزیدہ دو پیروں والی مادہ کو گھیر کر مار لینا کتنا آسان ہے۔"

شوکت سوچتی رہی۔

جوانی کے دس سال بارش، سردیاں، گرمیاں ویران دوپہریں اور تنہائیاں اور دس سال۔ اسے بتایا گیا تھا کی فطرت کے بنیادی تقاضوں کو مت بھولو۔ تم جس راحت اور خوش بختی کی

تلاش میں دن دن بھر یہاں سے وہاں بھٹکتی ہو، سڑکوں، بازاروں تیری میری چوکھٹوں ڈرائنگ روموں شامیانوں اور آڈیٹوریموں کی چھتوں کے نیچے اپنی نت نئی چھل بل کی چلبلاہٹیں لٹاتی رہتی ہو، یاد رکھنا کہ تمھاری برداشت کی قوت، غلیل کے ربڑ کی طرح ہے جسے ایک خاص حد تک ہی کھینچا جاسکتا ہے۔ پھر اس کے آگے وہ ٹوٹ بھی جایا کرتا ہے۔ شوکت کو خیالوں میں کھویا پا کر شہباز نے بات شروع کی۔

"کچھ پوچھوں۔۔۔؟"

"جی۔۔"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ گی"

"ضرور۔"

"پرتاپ کے بارے میں۔"

"کیا۔۔؟"

"مجھے بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں۔۔؟"

"جو ابھی تک نہیں بتایا ہے۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ ہے ضرور۔ تم چیخنا جانتی ہو لیکن چیخ نہیں پا رہی ہو۔ عورت کا سب سے بڑا گناہ احتجاج کرنے میں دیر کرنا ہے۔ افسوس کہ عورت جہاں دیر نہیں کرنا چاہئے وہاں دیر کر بیٹھتی ہے۔ پھر جب سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو۔۔۔"

"آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا۔۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ بولی۔۔ "میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ قدرت کو سستے غلے کی دکان کا پرمٹ دلا دے تو اس نے بتایا کہ فی الحال پرمٹ ان لوگوں کو دئے جا رہے ہیں جن کے اصل دھندے راتوں کے ہیں پھر بھی وہ قدرت کو پرمٹ ضرور دلوائے گا لیکن۔۔۔"

"لیکن۔۔؟" شہباز نے اپنی بھویں اوپر کیں۔

"لیکن۔۔۔" وہ کچھ دیر چپ رہی پھر آہستہ سے بولی۔ "پانی منگوائیے۔۔"

جب تک پانی آتا اور وہ اس سے اپنا حلق تر کرتی اس نے سوچ لیا کہ وہ شہباز کو سب کچھ بتانا چاہتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں بتا سکتی۔۔۔ وہ الفاظ تلاش کرتی رہی کہ کم سے کم شہباز کو اتنا ہی بتا دے کہ ہر عورت اپنی زندگی میں ایک ایسے مرد کا انتظار جانے یا انجانے میں ضرور کرتی ہے جو اس

سے کھلم کھلا، سب کے سامنے بغیر جھجک، مصلحت اور رازداری کے، اپنی محبت کا اقرار کرے۔ جو اس کی چاہت کو پہلے سات پردوں میں دھیمے دھیمے اپنے اور اس کے دل میں پکائے، پھر اس کی لذتوں کو اپنے اور اس کے ہونٹوں پر رکھے، پھر اس خمار آگیں دلنواز اور تڑپانے والے پیار کے انوکھے تجربے کو جو ابھی ان دونوں کی ذات تک ہی محدود تھا طشت ازبام کردے، پوری دنیا کے سامنے، چمکتے سورج کی روشنی میں بار بار اقرار کرے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ دیکھو، اور یہ دیکھو کہ اس کے قدموں کے اوپر ہی اس کا سر ہے۔ لیکن پرتاپ تو صاف لفظوں میں اسے بتا چکا تھا کہ وہ کسی ایسی سماجی شرافت زدگی کا قائل نہیں ہے جو اسے ساری زندگی شوکت جہاں کی کھوج کھلاتی رہے۔ لیکن پانی پی لینے کے بعد وہ شہباز خاں سے بولی۔

"باتیں تو بہت سی ہیں لیکن کیا فائدہ۔"

"شاید کچھ فائدہ ہو سکے" وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔

"آپ تو جانتے ہیں اس کا نام پرتاپ سنگھ ہے۔"

"ہاں"

"وہ گورکشا کی حمایت کرتا ہے۔ بالکل صاف صاف۔"

"اچھا تو۔۔۔؟"

"وہ بھی گائے کو ماں مانتا ہے جو پاکیزگی اور احترام کی علامت ہے۔"

"لیکن اس بات کا یہاں کیا ذکر؟" شہباز نے اسے ٹوکا۔

"اس لئے کہ میں نے اسے کئی بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں عورت ہوں، اور عورت کے لئے اپنی پاکیزگی اور عصمت کی بہت بڑی اہمیت ہے لیکن اس کے جواب نے میری آنکھیں کھول دیں۔

"کیسے۔۔۔؟" شہباز نے سوال کیا۔

"خدا جانے یہ خیال وہ تاریخ کے کس دور سے لایا ہے۔ وہ کہتا ہے پرانی کتابوں کی رو سے عورت کبھی پاک نہیں ہو سکتی۔ وہ سال میں بارہ بار گندی ہوتی ہے، بچہ رکھتی ہے تو بھی گندی رہتی ہے۔ زچگی کے بعد بہت دنوں تک اس کے پاس آنا بھی خود کو گندہ کرنا ہے۔ پھر سب سے دہشت انگیز بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ عورت اعلیٰ روایتوں کی کتنی ہی پاسدار کیوں نہ ہو، مرد کو پانے اور بھوگنے کے لئے کہیں بھی فاحشہ بن جانے میں دریغ نہیں کرتی۔ جب کہ گائے کی پاکیزگی اور

طہارت مسلم ہے، کیونکہ وہ ہانک بھی دی جاتی ہے تو طاہر رہتی ہے زخمی کئے جانے پر بھی اپنے زخم چاٹتی رہتی ہے، لیکن خود کو پاکیزہ یعنی بے ضرر رکھتی ہے۔ وہ ذبح ہو کر بھی لوگوں کو اپنی بوٹیاں کھلاتی رہتی ہے اور لوگ اس کے گن گاتے رہتے ہیں۔ مگر عورت گائے کی طرح بے ضرر نہیں وہ مرد کے سینہ پر سوار ہو کر کبھی کبھی اس کے جبڑے تک پھاڑ دینے تک کی قوت رکھتی ہے۔ وہ اسے تمناؤں کے لہلہاتے باغوں میں پھراتی ہے، وصل کی بہشتوں میں سلاتی ہے۔ اور ہجر کی دوزخوں میں جلاتی ہے۔ اس لئے مرد ایسی تمام چیزوں کو طاہر اور پاکیزہ ماننے میں صدیوں سے تامل کرتا آیا ہے۔ اور آگے بھی کرتا رہے گا، جو مرد کو للکارنے اور ایذا پہونچانے کی قوت رکھتی ہوں۔ کیوں کہ جو بے ضرر ہے وہی طاہر ہے۔

"تو پرتاپ تم سے کیا چاہتا ہے؟" شہباز نے ٹوکا۔

"جب مجھے ہمیشہ گندہ رہنا ہے تو کیوں نہ کبھی کبھی اس کے بستر پر بھی گندی ہوتی رہوں"

"تمہارا کیا رد عمل رہا؟۔" شہباز نے ٹٹولا۔

"میرا کوئی بھی رد عمل اس کے لئے اطمینان بخش ہی ہوا کرتا ہے۔"

"یعنی۔۔۔؟"

"اسے اطمینان ہے کہ میں ایک ایک کر کے ایسی تمام علامتیں ظاہر کرتی جا رہی ہوں جو کسی عورت میں بے ارادہ کسی مرد کے بستر تک پہونچنے سے پہلے ظاہر ہوا کرتی ہیں۔"

"اس وقت ملازم نے آکر خبر دی، راشٹریہ سیویکا سمیتی کی کوئی پرچاریکا ملنے آئی ہیں۔

"شہباز نے لگاتار محنت کے بعد تقریباً سو ہم خیال عورتوں کا ایک حلقہ تیار کر لیا تھا، جو شہباز کی بیوی کے خواب کو تعبیر دینے میں سرگرم ہوئی تھیں۔ انھوں نے اس تنظیم کا نام "کہکشاں" رکھا تھا۔ وہ شہر کی کمزور طبقے کی بچیوں، بے سہارا بیواؤں، یتیم لڑکیوں، بیوہ بوڑھیوں اور خاندانی اور گھریلو تشدد کی شکار غریب خواتین کی سماجی خوشحالی کے لئے مختلف پروگراموں کے ذریعے جدو جہد کر رہی تھیں۔ اس انجمن کا اپنا ایک بیت المال تھا۔ اس کے ممبر اپنے اپنے ہم خیالوں سے زکوٰۃ کی رقمیں، قربانی کی کھالیں اور سات سو تیس روپیہ سالانہ یعنی دو روپے روز کی امدادی رقم، اور مالدار افراد سے بڑی رقمیں لیتے تھے۔ انجمن کی اپنی ایمبولینس تھی جسے ایک چھوٹے موٹے

آپریشن روم اور لیبر روم میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ اس میں لائق اور تجربہ کار ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹروں وغیرہ کی خدمت حاصل کی جاتی تھیں۔ اگرچہ پسماندگی کا شکار مسلمان عورتیں اس انجمن سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہی تھیں، لیکن پڑھی لکھی بے شمار ہندو خواتین بھی اس تنظیم کو پیسے اور ہاتھ پاؤں سے اپنا تعاون دے رہی تھیں۔ کھلے ٹرک پر خاصہ کشادہ پلیٹ فارم بنا کر سستے لباس، میک اپ کا دیسی سامان، کچن کے لئے ریڈی میڈ کھانے پکانے کا سامان اچار مربّے وغیرہ کی نمائش ہوتی۔ اسی چلتے پھرتے پلیٹ فارم پر خواتین کو کام دلانے والی مختلف کار گر اسکیموں اور ان سے متعلق تنظیم کے ذریعے دیے جانے والے قرضوں کی بھی معلومات فراہم کی جاتیں۔ کبھی کبھی اسی چلتے پھرتے پلیٹ فارم پر خواتین کلاکار ناٹکوں کے شو کرتیں۔

شہباز کی مرحوم بیوی عائشہ کے دل میں اس طرح کی فلاحی تنظیم کے قیام کا خیال در اصل پشپا کھوٹے نے پیدا کیا تھا جو آر ایس ایس کی ایک تنظیم راشٹریہ سیویکا سمیتی کی ممبر تھی اور عائشہ کے کلاس فیلو بھی رہی تھی۔ پشپا نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے عائشہ کو بتایا تھا کہ سیویکائیں شادی شدہ زندگی گذارنے سے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ اس طرح سر سنگھ چالک بھی زیادہ تر برہمچاری ہی رہے ہیں۔ اس نے راشٹریہ سیویکا سمتی کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بتایا تھا کہ ایسا کہا جاتا ہے کہ سنگھ کی اہم رکن لکشمی بائی کیلکر جی ۱۹۲۶ کے آس پاس ایک بار ریل گاڑی میں سفر کر رہی تھیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے کچھ غنڈوں نے، جو مسلمان نہیں تھے، ایک ہندو جوان عورت کو اس کے شوہر کے سامنے ریپ کیا اور اس عورت کا شوہر صرف بے بسی کے ساتھ دیکھتا رہا اور کچھ نہ کر پایا۔ اس حادثے کو دیکھ کر کیلکر جی کو خیال آیا کہ ہندو خواتین کی ایک ایسی تنظیم قائم ہونی چاہئے جو عورت کو خود اپنے دفاع کے لئے تیار کر سکے۔ اس لئے سمیتی دو خاص باتوں کو اہمیت دیتی ہے۔ پہلی، ہندو عورت میں مزاحمت کرنے کی طاقت کے لئے جسمانی تربیت، اور دوسری اس کو آدرش ہندو ناری بنانے اور ہندو تہذیبی قدروں پر اس کی گرفت مضبوط کرانے کی نظریاتی تربیت تاکہ ہندو عورت ہندوستانی سماج کی اہم ترین خاندانی اکائی کے طور پر مضبوط رہے اور بدیسی عناصر کا لایا ہوا انتشار اسے منتشر نہ کر سکے۔

پشپا کھوٹے کو شہباز باہر کے دروازے سے احتراماً اپنے ساتھ نشست تک لے کر آیا اور

شوکت سے اس کا تعارف کرایا۔ پشپا بیگنی رنگ کے بارڈر کی سفید سوتی ساڑی میں ملبوس تھی، پیروں کی چپل کا ایک تسمہ ٹوٹنے کو تھا جس کے سبب پشپا وہ پیر کچھ احتیاط سے رکھ رہی تھی۔ بیٹھتے ہی وہ مسکرا کر بولی۔

"سال میں تین جوڑ چپلیں گھستی ہوں۔"

آر ایس ایس کا نام سنکر شوکت جہاں کے اندر جو تجسس پیدا ہوا تھا اسے ختم کرنے کے لئے وہ جلد ہی پشپا سے بے تکلف ہو گئی اور بہت سے سوال کر ڈالے۔ پشپا اسے بتاتی رہی کہ سنگھ دراصل سماج کا سنگھٹن ہے۔ وہ ایک پریوار ہے جو راج نیتی سے پرے ہے۔ اور پریوار استری کے بنا سمھو نہیں ہے۔ اور استری گھر میں سب سے پہلے دھرم پتنی کے روپ میں آتی ہے۔ وہی ہمارے اچھے سنسکاروں کی دھروھر ہے۔ جنھیں وہ اپنی سنتانوں کو دیتی ہے اور اس طرح اپنی پراچین سنسکرتی اور سبھیتا کو بھویشے کے لئے سنجو کر رکھتی ہے۔

"آپ لوگ کیا کیا کام کرتی ہیں۔"

"سادھارن ہندو میلا کو بھارتیا تا کی سیکھ دیتے ہیں ہم، وہ بھی بس آپس میں کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر۔"

پھر وہ یکایک شوکت جہاں سے پوچھ بیٹھی۔

"آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" شوکت مسکرائی۔

"ایسا کیوں۔" "آپ کو کچھ کرنا چاہئے۔"

"کیا؟"

"مسلم میلاؤں کو اس یوگیہ بنائیے کہ وہ راشٹر پر بوجھ نہ بن کر راشٹر کی سمپتی بن سکیں۔ عائشہ نے کتنے بہت سے کام چھوڑے ہیں کرنے کو جنھیں شہباز صاحب چلا رہے ہیں۔"

تب شہباز کسی کام سے اندر گیا۔ تو شوکت دھیرے سے بولی۔

"ایک بات بتائیے۔ بلکہ کوئی منتر دیجئے مجھے۔"

"منتر یا سوتر؟" پشپا نے صحیح مترادف لفظ سمجھایا۔

"ہاں۔ کوئی نصیحت۔" شوکت گردن جھکا کر بولی۔ "میں ہر دم ڈری ڈری سی رہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں خود پوری طرح سمجھ نہیں پارہی۔"

"ڈر تو اندر رہتا ہے، باہر کوئی ڈر نہیں ہوتا۔" پشپا نے کہا۔

"کوئی مجھے ڈرا رہا ہے۔"

"کس بات کے لئے؟"

"جوان عورت کو کوئی کس لئے ڈراتا ہے؟"

"آپ ڈرنا چاہ رہی ہونگی۔" پشپا اطمینان سے بولی۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" شوکت نے صفائی دینا چاہی مگر آگے کچھ نہ بولی تو پشپا نے بات آگے بڑھائی۔

"آپ کے پاس ڈرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ شاید اس لئے نہیں ہے کہ آپ کو ڈرانا نہیں آتا، جب کہ استری کے لئے سب سے سرل کام مرد کو ڈرانا ہی ہے۔

"کیسے؟"

"اپنے آتم سمان کو شریر سے ہی نہیں، من سے بھی مضبوط رکھ کر۔"

"آپ خود عورت ہیں اور عورت کو اس کا کھویا ہوا سمان دلانے کے کام میں اپنی طرح سے لگی ہیں اور قربانی دے رہی ہیں۔ اس لئے آپ سے اُپائے پوچھ رہی ہوں۔" وہ ہندی بولنا چاہ رہی تھی۔

"اگر تم اپنی سرکشا خود نہیں کر سکتیں تو کوئی تمھاری سرکشا نہیں کر سکتا۔"

"میں نے جوڈو کراٹے بھی سیکھا ہے۔"

"جو ہمت پستول پکڑنے کے لئے کافی ہوتی ہے وہ گولی چلانے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔" پشپا نے دھیرے سے کہا اور اس کا ٹیلیفون نمبر مانگ کر اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا۔

شہباز دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو پشپا نے بتایا کہ وہ عائشہ کی یاد میں منعقد کیے جانے والے تقریروں کے مقابلے کی صدارت کے لئے شہباز کو مدعو کرنے آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد شہباز بہت دیر تک شوکت جہاں کو شہر میں خواتین کی مختلف تنظیموں کے سیاسی کردار اور اغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے اپنی تنظیم کے لبرل ہیومن ازم (LIBERAL HUMANISM) کا ذکر کرتے کرتے ایک پل رکا اور شوکت کو گھورتے ہوئے بولا۔

"سنو! تم آخ تھو کہہ کر تھوکنا تو جانتی ہونا۔؟" شوکت نے اقرار میں گردن ہلائی۔

شہباز بولا۔۔ ”تم اب کی بار پرتاپ کے منہ پر تھوک دینا۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔“

دیر رات وہ ڈائری جو ٹیبل لیمپ کی روشنی میں شہباز کے ہاتھوں میں تھی اور جس پر ایک نسوانی تحریر کئی صفحوں پر پھیلی ہوئی تھی اسکی بیوی عائشہ کی تھی۔ صفحے کے داہنی جانب تاریخ اور مہینہ درج تھا، جسے دیکھ کر شہباز نے ٹھنڈی سی سانس لی، وہ عبارت کو پڑھنے لگا۔

”اب میں چالیس کے آس پاس پہنچ چکی ہوں۔ جس دن پیدا ہوئی اس دن شہر کی سڑکوں پر جتھے بنا کر لوگ گاندھی جی کو گولی مارنے والے کے نام کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ بعض جگہوں پر مسلمانوں پر قہر برپا کرنے کی آدھی تیاری اس توقع میں کی جا چکی تھی کہ مارنے والا مسلمان ہی ہوگا، میں سرکاری اسپتال کے بستر پر تھی۔ انھیں دنوں میرے ابّو یونیورسٹی کے اپنے لکچروں میں پڑھا رہے تھے۔

اب حکومت جمہور کی ہوگی

اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لئے کہیں جمہور کا سیاسیائے جانے کا کام ہوگا تو کہیں تہذیب یائے جانے کا کھیل بیرونی جمہوریتوں میں جمہور کو بازاریائے جانے کے ابتدائی نقوش دکھائی دینے لگے ہیں۔ میرے باپ نے اپنے داماد یعنی شہباز کو Hopeless کہا تھا۔ پتہ نہیں کیسی امیدیں باندھے ہوئے تھے وہ شہباز سے لیکن اب مجھے بھی شہباز Hopeless ہی لگتا ہے۔

میرا میاں کبھی کبھی کارخانے کے اندر اسلامی مشاعرے کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں شاعر ابھی بھی عام طور پر حضور کی کاکلوں اور آنکھوں کے سرمے سے آگے کچھ نہیں لکھ پا رہے ہیں۔

بہت دنوں پہلے جب شہباز کے پاس یہ کوٹھی نہیں تھی، جب اسکی تجارت چند معمولی کاریگروں کے بنائے گنتی کے جوتوں تک ہی محدود تھی میں نے اسکوجج پر جانے والے کسی دوست کو ٹرین پر سی آف کرنے کے بعد ہنسی ہنسی میں یہ شعر سنائے تھے،

یثرب کے جانے والے میرا اسلام لے جا
میرا اسلام کہکر پھر ان سے یہ بھی کہنا
یاد آرہا ہے ہمکو انکی زمیں کا سونا
دو لڑکیوں کی موئی کرنی ہے ہمکو شادی

سو تولے میں ہر اک کا زیور بنےگا ہادی
حج کر کے پھر وہاں سے لندن بھی جائیں گے ہم
داماد سے ضیافت اپنی کرائیں گے ہم

شعر سن کر اسکی طبقاتی سوچ کو دھکا لگا تھا۔ ان تمسخرانہ اشعار کے خلاف وہ مجھ سے لڑا تھا، کلاس بدل جائے تو سوچ بھی کتنی بدل جاتی ہے۔ اب وہ نام والوں اور سماجی حیثیت والوں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ وقت کتنا بدل چکا ہے اب یہ لوگ مقامی حکام کے کمروں میں بلا اجازت دندناتے ہوئے گھس جاتے ہیں۔ سب پر ہی مقامی انتظامیہ پر اپنا اثر مسلط کئے رہنے کا جنون ہے۔ میرا ڈرائنگ روم پچاسوں بار انتظامیہ کے افسران کے گھیراؤ کے لئے استعمال ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلا ایس پی اپنی بیوی کے ساتھ کئی بار ہمارے لان میں تلے ہوئے کاجوؤں کے ساتھ وہسکی پی چکا ہے اسکی گوری چٹی بیوی ہمارے ساتھ KITY کھیل چکی ہے۔ کلکٹر صاحب بھی بیوی کے ساتھ آ چکے ہیں انکو مغلائی کھانے اچھے لگتے ہیں۔ شہباز کا خیال ہے کہ اگر تم اپنے شہر میں سربلند نہیں تو صوبے میں کیا ہو گے ملک کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جب ایس پی کو لان سے اٹھا کر شہباز اندر کے کمرے میں لے گئے تو اسکی گوری چٹی اور لمبی تڑنگی بیوی پتوں کو پھینٹ پھینٹ کر بتاتی رہی کہ سارے شہر میں یہی ہووے ہے۔ ایس پی صاحب لان سے اٹھکر مردوں کے سنگ بند کمرے میں چلے جاوے ہیں۔

جانی غلط نہیں کہتی تھی، انھیں بند کمروں میں حاکموں کو یاد دلایا جاتا تھا کہ وہ ضلع میں خود نہیں آئے بلکہ لائے گئے ہیں اور کام انھیں قانون کے مطابق نہیں لانے والوں کی ایما کے مطابق کرنا ہے تو ایس پی جھنجھلا کر ڈائرکٹر جنرل آف پولیس سے اپائنٹ منٹ لیتا ہے ساتھ میں آئی جی کو بھی لے جاتا ہے، ڈائرکٹر جنرل اسکی بات سنتا ہے پھر ایس پی کو باہر کر کے آئی جی سے کہتا ہے کہ وہ ایک سال بعد سبکدوش ہونے والا ہے اور حالات کو ٹھیک کرنے کے لئے کہیں کوئی سیاسی منشاء بھی نظر نہیں آ رہی اس لئے جیسے بن پڑے اپنا وقت کاٹو اور کوئی ایسی بات نہ ہو کہ ودھان سبھا میں سوال اٹھایا جائے۔

آخر کار ایک دن ایس پی بے چارہ خفیہ رپورٹوں کی فائلوں کے فیتے باندھے بغیر انھیں ٹرے میں پٹک کر جلدی جلدی اپنی رپورٹ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

"اپنی ملازمت میں یہ ساتواں ضلع دیکھ رہا ہوں، اس لئے مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ شہر بھی باقی شہروں کی طرح ایک ایسا آزمودہ کار میکانزم تیار کر لینے میں پوری طرح کامیاب ہو چکا ہے جو جب چاہے کسی بھی سچ کو چھپا لے جائے اور کسی بھی جھوٹ کو پوری مہارت کے ساتھ تشہیر

کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہاں اس سال شہر اور آس پاس کے چند علاقوں میں دو بار مجموعی اور ایک بار خصوصی حیثیت کے فرقہ وارانہ فسادات کا بلیو پرنٹ تیار کیا گیا ہے۔ ان فسادات کا مقصد چند دیگر جگہوں کے فسادات سے مختلف ہے جہاں عوام کو نئی تاریخ لکھ کر مخصوص تناظر میں تہذیب یا ئے جانے کے لئے فسادات کئے گئے تھے۔"

میرے ساتھ لان میں KITY کھیلنے والی ایس پی کی لمبی تڑنگی بیوی اپنی مانگ میں بڑا گھرا سندور لگائے ہوئے تھی میں نے اسے ٹوکا تو اس نے بتایا تھا کہ وہ روز اپنے شوہر کی سلامتی کے لئے منتروں کا جاپ کر کے سندور لگاتی ہے اور پھر سارا دن کنٹرول روم سے اپنے شوہر کی نقل و حرکت کی معلومات کے لئے رابطہ قائم رکھتی ہے اور جب تک کوٹھی کے پھاٹک کے اندر انکی جیپ واپس نہیں آتی بُرے بُرے خیالات سے لڑتی رہتی ہے کہ شام تک بلڈ پریشر نارمل نہیں رہ پاتا۔ وہ لمبے وقت تک اپنے سہاگ کے لئے پوجاپاٹ کرتی تھی شوہر کی آرتی اتار کر کہتی تھی،

"قانون جائے چولھے میں، محکمہ جائے سمندر میں بھگوان کے لئے پہلے تم اپنے کو بچانا"

نئے ایس پی کی بیوی کو تو ان سپاہیوں پر بھی اعتماد نہیں جو اسکے شوہر کے آس پاس حلقہ بنائے رکھتے ہیں وہ اپنے بیٹے کو کبھی پولیس میں نہ بھیجے گی۔ اسکے تجربے کے مطابق پولیس کانسٹبل اب اعصابی طور پر بہت زیادہ مضبوط نہیں ہوتے پھر انکے ہاتھ میں رائفل بھی ہوتی ہے جسکو صرف پکڑے پکڑے وہ تھک چکے ہوتے ہیں۔ دفتر ہو یا باہر آئے دن انکی مرضی کے خلاف اتنا زیادہ کچھ ہوتا رہتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کی بوریت اور ناہمواری کو بیڑیاں پھونک کر اور ہتھیلی پر تمباکو مل کر بھی کبھی برداشت نہیں کرپاتے اور اس بوریت کو تشدد کی چاٹ سے بہلانے میں لگ جاتے ہیں۔ اسکے شوہر کا ایک اردلی سپاہی اسکے تین برس کے بچے کو بہلا رہا تھا کہ پیار دلار میں بچے کو چھاتی سے بھینچ کر گال پر ایسے دانت گڑوئے کہ دانت کے ایک نشان سے خون چھلک آیا

میں نہیں چاہتی کہ شہباز سموچا کا سموچا اسطرح 'بازاریا، لیا جائے یا، سیاسیا، لیا جائے یا، مذہب یا، لیا جائے یا تہذیب یا، لیا جائے کہ مغلائی اور چائنیز کھانوں کے ذائقے اور خوشبوؤں کے فرق کی تمیز کھو بیٹھے۔ لیکن اب بہت کچھ ایسا ہی ہونے لگا ہے، میرے سنٹ اس پر خاطر خواہ اثر نہیں کرتے، جسکی سونگھنے چکھنے دیکھنے اور سُنے کی قوت چھن جائے اسے کیا کہا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں وہ سیاست سے دور رہے اور فلاحی کاموں میں دل لگا کر میرا ساتھ دے مگر وہ کہتا ہے کہ اب ہمارے ارد گرد کوئی بھی کام ایسا نہیں بچا ہے جس میں سیاست کا عمل دخل نہ ہو۔ اسکا ماننا ہے کہ ایسی کوئی بھی

اسکیم جس میں کسی طرح کے روزگار یا ملازمت کے موقعے بھی شامل ہوں، صاحبان اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دیتے ہیں جو انکے سیاسی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں، جن میں سر فہرست، ایم پی اور ایم ایل اے وغیرہ ہوتے ہیں تا کہ ان مواقع کے ذریعے وہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچا سکیں جو ضرورت پڑنے پر انکے سیاسی اغراض کو ہر قیمت پورا کر سکیں۔

شہباز بے حد Time Conscious ہو چکا ہے۔ میں نے فیکٹری سپر وائزر کی ایک جگہ کے لئے ایک تجربہ کار مسلمان کاریگر کی سفارش کی تھی مگر اس نے کاریگر کو نہیں رکھا، اس لئے کہ اس کاریگر کے گھر کے لوگ دیر رات تک گپ بازی کرتے تھے اور پھر دن چڑھے تک سوتے تھے۔ شہباز کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کی کاریگر کے کھانے میں سرخ گوشت کا استعمال بہت ہوتا تھا جس سے لوگوں کو دن میں بھی نیند ستاتی ہے، مجھے اپنی سفارش کے ٹھکرائے جانے کا بڑا افسوس تھا میں نے شہباز سے صاف کہہ دیا تھا کہ جب غریب اور ایماندار مسلمانوں کو وہی نوکری نہیں دے گا تو پھر دوسرے کی کیا شکایت کی جائے میرے یہ کہنے پر کہ میرا سفارشی نیک اور ایماندار تھا اس نے مجھے سمجھایا کہ شریف اور نیک سپر وائزر کارخانوں کی لٹیا ڈبو دیا کرتے ہیں۔ کارخانے یتیم خانے نہیں ہوتے ایک سے ایک حرامزادے سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے سپر وائزر کو کوّے کے کان، چیل کی آنکھ اور چیتے کی جست رکھنا پڑتی ہے اور زیادہ تر نچلے متوسط طبقے کے مسلمان ان خصائل سے محروم ہیں، کیونکہ کواب پراٹھے اور کلیجے نہاری کی تہذیب نے انھیں اردو میں غصّہ کرنے کا عادی بنا دیا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اسکا سپر وائیزر دیر سے کام پر آنے والے کو اردو میں اس طرح ٹوکے،

'اتنی تاخیر سے آپ تشریف لا رہے ہیں، مزاج تو ٹھیک ہیں؟'

شہباز نے ڈائری کا صفحہ پلٹتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی کیونکہ اگلے صفحہ پر وہ احوال تھا جو عائشہ سے شہباز کے لاکھ چھپانے کے باوجود عائشہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسکو چھاتی کا کینسر ہے، لیکن اس احوال کے فوراً بعد ہی عائشہ نے اگلے صفحات پر رات کے اندھیرے میں کوٹھی کے ایک کمرے میں شہباز کے ذریعے کسی بد ہیبت مرد کو بازو میں لگی گولی کے زخم کے ساتھ پناہ دینے کا واقعہ بھی عائشہ نے اپنے انداز میں لکھا تھا، وہ آدمی کسی ہندو نیتا کا بھیجا ہوا تھا، کیونکہ بعد میں اس نیتا کا شہباز کے پاس فون آیا تھا اور اس نے شہباز کو بند بند لفظوں میں زخمی کے بارے میں کچھ ہدایات دی تھیں بعد میں پتہ لگا

کہ وہ آدمی کسی قصبے سے بھاگ کر آیا تھا جہاں فساد برپا کرنے کے لئے لوگوں کو تین دستوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور تینوں دستوں کو الگ الگ ذمے داریاں سونپی گئی تھیں، پہلے دستے کو فساد کی پہلی منزل یعنی لوٹ پاٹ کے کام میں لگایا گیا تھا دوسرا دستہ چھرابازوں کا تھا اور تیسرا دستہ مقامی اشراف کا تھا جنکی ذمے داری متاثر لوگوں کو پناہ گزینوں کے کیمپ تک پہنچا کر انکی بحالی کے انتظامات کرنا تھا، زخمی پہلی ٹکڑی سے تعلق رکھتا تھا اور لوٹ پاٹ میں پولیس کی گولی کھا کر بھاگا تھا۔ بحالی کا کام پیسہ اور وسائل بھی مانگتا تھا اس لئے اس ٹکڑی میں بااثر اور متمول حضرات کا رکھا جانا ضروری تھا جنکی قیادت کرنے والوں میں شہباز کے ساتھ اسکا ایک ہندو دوست بھی تھا جو پچھلے آٹھ سال میں تین سیاسی پارٹیاں بدل چکا تھا۔ تقسیم کے بعد آزاد ہندوستان میں جمہور کو کس کس نہج اور کیسے کیسے طریقوں سے اپنے فائدے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اس کام کے کیئے عائشہ نے لکھا تھا کہ ہمارے عہد کے سرمایہ کاروں اور انکے حوالیوں کو ڈاکٹریٹ دی جانی چاہئے۔۔ آگے عائشہ کے لفظ یوں تھے،

"جب سب اپنا اپنا کام کر رہے ہیں تو میں بھی کسی کام کو ٹھان کر اسمیں کیوں نہ لگ جاؤں یا پھر اپنی چھاتی کے پھاۓ ہی بدلتی رہوں اور اپنے مقدر کو کوستی رہوں۔ عائشہ نے زخموں پر پھاۓ رکھنے کا کام قبول کر لیا مگر مختصر سا زمانہ ہی گزرا ہوگا کہ موت دروازے پر دستک دے رہی تھی۔۔۔

رات نو بجے شوکت جہاں کے فون کی گھنٹی بجی۔ لاین پر پشپا کھوٹے نہیں پرتاپ شکلا تھا۔

"میں ہوں۔" ہلو کے بجاۓ وہ میں ہوں، کہکر ہی مخاطب ہوتا تھا۔

"کہیئے۔"

"جسے تم سب سے زیادہ چاہتی ہو اس کی قسم فون رکھنا نہیں"

"ٹھیک ہے۔"

"یہ جو نے ہیتا ہے نا، جسے MORALTY کہتی ہو تم۔ اس کی پرکھ کے لئے مرد اور عورت کے بیچ شاریرک سمبھوگ کو آدھار بنانے کے دن اب لد چکے ہیں۔ میں تم سے بھگوان کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں، میری چاچی کی جوان لڑکی بہت سمجھدار، بہت گنی، سماج کو آگے بڑھانے کے لئے پرتی بدھ، ۱۹ سال کی عمر میں ایک بار نرودھ پھٹ جانے پر کنواری ماں بن گئی۔ کیا کرتے؟ زمین میں آدھا

گاڑ کر سنگ سار کر دیتے ؟ جن کے ساتھ ایسا کیا جاتا رہا اور جو ایسا کرتے رہے انھوں نے بھلا کیا بنا لیا، ابارشن ہو گیا۔ چلو چھٹی۔

"!" "اچھا ہو گا کہ آپ کسی دوسرے موضوع پر بات کریں۔" شوکت نے ٹوکا۔ "ضرور کروں گا۔" پرتاپ جلدی سے بولا۔ "پریوار کی پوترتا کیا تم کو دکھائی دیتی ہے کہیں ؟۔ آج کون تمھارے کام آرہا ہے ؟ باپ رہا نہیں، ماں کا حال۔ دیکھ ہی رہی ہو۔ رہ گیا بھائی وہ سالا ایک نمبر کا بیوقوف ہے۔ پھر بھی میں اسے سستے غلے کی دکان کا پرمٹ دلانے والا کام لگ بھگ کر ہی لایا ہوں۔"

"سچ بتایئے!"

"اتنی سی بات کے لئے جھوٹ کیا بولوں گا۔ جھوٹ تو تم بول لیتی ہو۔"

"میں نے کیا جھوٹ بولا ؟"

"سیکڑوں سال پرانے آدرشوں کی تیمارداری میں پھنس کر تم سچے اور تندرست وچاروں سے، جو تم کو آرام اور خوشیاں دے سکتے ہوں، منہ موڑ رہی ہو۔ ان کے لئے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی ہو۔ یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے ؟۔"

"قدرت کا کام کب تک کرا دیجئے گا۔ آپ تو یہ بتایئے۔"

"شکھیہ منتری دورے پر ہیں۔ واپس آجائیں، جس دن سے ملے گا، ہو کائے گا۔"

"مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے۔"

"اسی میں تمھاری آزمائش ہے۔"

"میری آزمائش ؟"

"ہاں۔"

ادھر سے فون رکھ دیا گیا۔ شوکت نے طے کر لیا تھا کہ وہ مرحوم عائشہ کی تنظیم کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے گی۔ پھر اس نے قدرت والا تازہ اخبار اٹھایا۔ بے دلی سے پلٹا۔ شوکت کے ہاتھ سے اخبار سرک گیا، اسے نیند کی جھپکی آگئی تھی۔

اس رات امس بہت تھی۔ پرتاپ شکلا کے کولروں کی ٹھنڈی ہوا کے درمیان عبدل بکر

قصاب پرتاپ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ پرتاپ نے اسے کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے دوبار کہا بھی، لیکن وہ نہیں بیٹھا۔ اس نے پرتاپ کو یقین دلایا کہ مانا کی عبدل کا ایک لڑکا ڈاکٹری میں داخلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے لیکن عبدل رہے گا تو پرتاپ کی پرجا ہی۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ عبدل سے کسی اور موقع پر اگر پوچھا جاتا کہ ودھائک پرتاپ شکلا سے وہ کتنی دھونس کھاتا ہے تو وہ اپنے لنگوٹ کی طرف اشارہ کرتا اور بڑے آرام سے کہہ دیتا۔ لیکن عبدل جانتا تھا کہ ایک برہمن ودھایک اپنے پیر چھوئے جانے پر کتنی خوشی محسوس کرتا ہے۔ لیکن اب پیر والے بھی چالاک ہیں وہ ہاتھ جوڑ کر گھگھیانے والوں کے ناٹکوں سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ لہذا شکلا اکتا کر بولا۔۔

''آئے کس لئے ہو تم تو یہ بتاؤ''

عبدل نے پہلے تو یہ بتایا کہ اس کی برادری کے لوگ مکھ منتری کے پاس گئے تھے۔ لیکن اس کے مالک تو پرتاپ ہیں اس لئے وہ سیدھے پرتاپ شکلا ہی کے پاس آیا ہے۔ پھر اس نے معاملے کی بات شروع کی۔ شہر میں ہماری برادری کے ہزار ڈیڑھ ہزار لوگ۔ تو ہوں گے ہی، ان کے خاندانوں کو جوڑ کر پانچ سات ہزار ووٹروں کی برادری تو ہے ہی۔ ہمارے باپ دادا پارٹی کے ہمیشہ ہی وفادار رہے۔ ہم نے کبھی کسی اور طرف دیکھا ہی نہیں۔ آپ سب کے ہوتے ہمیں بے عزت کیا جا رہا ہے۔ ہمیں چور ٹھہرایا جا رہا ہے ہمارے سینے پر سوار ہو کر ہمارے حلق میں جبراً آم ٹھونسے گئے۔ ہم تین دن تک چارپائی پر ہی ٹٹی کرتے رہے۔ سرکار بچ گئے نہیں تو جان چلی جاتی۔''

عبدل سے مطلب کی باتیں ملنے کی امید میں پرتاپ شکلا کی دلچسپی بڑھی اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ذرا اطمینان سے عبدل نے ممو خاں کے باغ کا دردناک قصہ پوری تفصیل سے بتایا۔

پھر وہ دھیرے سے بولا۔

''یہ سارا کام جوتے والے شہباز میاں کا ہے۔''

''شہباز میاں؟'' پرتاپ نے دہرایا۔

''جی سرکار، ممو خاں باغبان ان کے یار ہیں۔ کس کے ذریعہ ہوا ہے یہ بھی سن لیجئے۔''

''کس کے ذریعہ؟'' پرتاپ نے پوچھا۔

''یہ چال شہباز خاں کی رکھیل نے چلوائی ہے حضور۔''

''رکھیل کون؟''

"آپ تو سب جانتے ہیں حضور، مجھ سے کیا پوچھتے ہیں"

"مجھے کیا پتہ، تم بتاؤ۔"

"حافظ قدرت کو تو آپ جانتے ہیں، کانگریس کو گالیاں لکھتا رہتا ہے۔"

"تو۔۔اس سے کیا؟"

"اس کی بہن شوکت۔ پورا محلہ جانتا ہے حضور۔"

"کیا۔۔؟" پرتاپ کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"یہی کہ وہ شہباز کی رکھیل ہے، دن میں دو دو تین تین بار کسی وقت بھی شہباز خاں کی بڑی گاڑی آتی ہے اسے لینے، اور اب تو سنا ہے وہ ان کے لئے میلا گھر میں اچھے رتبے پر نوکر بھی رکھی جا رہی ہے۔"

"شوکت جہاں کو کہہ رہے ہو تم۔۔وہ رکھیل ہے شہباز کی؟" شکلا نے اپنی آواز کی کمزوری چھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں کیا پورا محلہ کہتا ہے۔۔چپکے چپکے۔۔"

"شہباز کی گاڑی گھر لینے آتی ہے اسے۔؟" پرتاپ نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

"کھلے خزانے، دروازے پر ہارن بجاتی ہے۔ بڑی مونچھوں والا ڈرائیور میری دکان کے سامنے سے لے کر نکلتا ہے۔"

"تم نے دیکھا ہے؟"

"سب دیکھتے ہیں کیا ٹھاٹ دار ساڑیاں نکل رہی ہیں روز، اتوار کو دیکھا نیلی پتلون اور کھلی باہنہ کی بنیان میں تھی، صاحب چولی بھی اندر نہیں تھی، خود اس کی عورت تو رہی نہیں، اسی لئے تو ہر دم آگے پیچھے عورتیں ہی ہیں اس کے۔ بڑا خدمت گار بنا پھرتا ہے عورت کا۔"

"تم کو کیسے معلوم کہ شوکت جہاں کا ہاتھ تمھارے معاملے میں ہے؟"

"اپنے بچوں کی قسم حضور، میرا شک ٹھیک ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"اسی رکھیل نے مجھ سے ایک دن کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

"کہا تھا۔" عبدل چپ ہو گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔ ہونٹ

جذبات سے پھڑ پھڑائے۔

"بتاؤ نا۔"

"کہا تھا۔۔۔ اچھے آم جب کھاتا ہوں مجھے بتا دینا۔"

پرتاپ شکلا کچھ دیر چپ رہا۔ عبدل بھی کچھ نہیں بولا۔ پھر ایک لمبے سناٹے کے بعد پرتاپ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کچھ بڑبڑایا۔۔۔

عبدل خاموش رہا۔۔ پرتاپ نے سوچا، پچھلے کچھ عرصے سے مخبر جو خبریں دے رہے تھے وہ زیادہ غلط نہیں تھیں۔

پرتاپ شکلا ہوائی جہاز سے آنے والے کسی نیتا کو لینے ایرپورٹ جارہا تھا۔ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر ڈرائیور کو بانٹ کھول کر انجن پر جھکا ہوا دیکھ تو رہا تھا لیکن دماغ سے گاڑی، راستہ، ایرپورٹ سب او جھل تھے۔ پیڑ کے سائے میں وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

"آتی تھی، ادھر ادھر کی باتیں بناتی تھی، مٹک کر ایک آدھ ادائیں دکھاتی تھی، لگاوٹ سے مسکرا کر دانتوں کی بجلیاں چمکا کر، ذرا ٹھسے سے پاس بیٹھ کر، اپنا کام نکالتی تھی اور پھر دھتا بتا کر چلتی بنتی تھی۔" اس کی یادداشت کے پردے پر پورے راستے بھر شوکت جہاں کی ہی تصویر ابھر اور ڈوب رہی تھی۔

"فون لگوا کر دیا۔ بھتیجی کی شادی کے موقعے پر سرکاری غلہ، شکر، تیل، چوری کی بجلی اور ریسٹ ہاؤس کا انتظام کرایا۔ خالہ کے اوباش لونڈے کو تھانے پر سے چھڑوایا۔ فساد میں ایس پی سے کہہ کر پولس گاڑی میں پورے گھر کو خطرے سے باہر نکلوا کر ایم ایل اے کوارٹر میں جگہ دلوائی۔ اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ سے خود مل کر چچا کی لڑکی کو بچہ جننے کے لئے زور زبردستی کر کے وارڈ دلوایا۔ اسٹور سے دوائیں مفت دلوائیں۔ پانی کی وی آئی پی لائن سے اس کے گھر کے نل کا کنکشن کروایا۔ پڑوسی جب بالٹیاں لئے سڑک پر کتوں کی طرح لڑ رہے ہوتے تو یہ دن میں تین تین بار نہاتی۔ جو کہتی تھی کرا ہی دیا کرتا تھا۔ سوشل ویلفیر اسکیموں سے فرضی آنگن باڑی کے لئے گرانٹ حاصل کرنے کے لئے جب دیکھو دروازے پر کھڑی بل بجا رہی ہے، وہ بھی کرایا۔ بچوں کو تقسیم

کرنے والی بڑی: بڑی ڈبل روٹیاں گھر میں ڈھیر لگنے لگیں۔ امدادی کیمپ میں تقسیم کئے جانے والے دلی سے بھیجے گئے اچھی کوالٹی کے کمبل دیکھ کر پھسل پڑی تھی۔ جب جتنے چاہے اٹھا کر اپنے رشتے ناطے والوں کے لئے لے گئی۔ میں نے ہاتھ نہیں پکڑا۔ سوار میری چھاتی پر ہوتی، اپنے کام مجھ سے نکلواتی اور اب گھنڈیاں دوسرے کے لئے اچھال رہی ہے۔ ذرا آنکھ بھر کر دیکھتا تھا تو کہتی تھی۔ آپ سے ڈر لگتا ہے۔" اب اس کی گاڑی میں گھوم رہی ہے! اس کی کوٹھی میں لیٹ بیٹھ رہی ہے! چھاتیاں اندر کھلی چھوڑ رکھی ہیں تو ڈر نہیں لگتا۔ یہی تو دیکھنا تھا کہ یہ لئے دیے رہنے کا ڈھونگ اور کتنا چلے گا۔"

پرتاپ شکلا نے دیکھا ڈرائیور گاڑی آگے بڑھانے کے لئے سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شوکت کے نام پر دس جوتے مارتے ہوئے پچھلی سیٹ میں دھنس گیا۔

یہ اس رات کی بات ہے جب پرتاپ شکلا نے اپنے گھر پر افطار پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ افطاری لگانے کا کام اس نے کچھ ہندو عورتوں کے ساتھ شوکت کے سپرد کیا تھا۔ پڑوس کی مسجد سے غروب آفتاب پر گولہ داغا گیا۔ افطار ہوا۔ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد پرتاپ تھکی ہوئی شوکت سے بولا۔۔

"تم نے سنا ہوگا۔ سب لوگوں سے سنا ہوگا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ ہندو اپنی وچار دھارا اور اپنی سوچ میں بڑا سہن شیل اور اہنسا پریمی ہے۔"

"تو؟" وہ بولی۔

"پر وچار دھارا سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا اچھا سوچنا یا اچھا ماننا ایک بات ہے۔ اور ہمارا ہر دن کا سادھارن برتاؤ یہ دوسری بات ہے۔ دونوں کے بیچ کوئی سمبندھ نہیں ہوتا۔"

"ہونا تو چاہئے۔" شوکت بولی۔۔

"جیسا کرنے میں ہمیں زیادہ فائدہ ہوتا ہے ہم ویسا کرتے ہیں اس میں ہندو یا مسلمان وچار دھارا کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔"

یہی بتانے کے لئے آپ نے مجھے روکا تھا۔"

"ہاں۔۔ اور ہاتھ جوڑ کر بڑی نمرتا سے کچھ اور بھی بتانے کے لئے۔" پرتاپ نے نظروں میں لجاجت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے شوکت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اب سمجھ دار لوگ یہ یقین کر کے جیتے رہتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر گھڑی اچھا برا سب کچھ ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور جنگ میں زخم کھانے والا سپاہی پرم ویر چکر کے لئے نہیں، اپنے بچاؤ کے لئے زخم کھاتا ہے۔ اس نے شوکت سے التجا کی۔ "تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں جب تک بھی جس طرح بھی جیسا بھی زخم کھا کے اپنے کو بچا سکتی ہو، بچاتی رہو اور دوسروں کو مرنے دو۔ کیونکہ مر جانے والے کا پرم ویر چکر زندہ کے ہاتھ میں ہی دیا جاتا ہے۔" پھر دونوں میں پہلی بار ہاتھا پائی ہوئی۔ پرتاپ کپڑے کے نیچے آزاد اور مچلتی ہوئی گھنڈیاں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ تب شوکت جہاں نے وہی کیا جو شہباز نے اس سے کہا تھا اور بعد میں پشپا کھوٹے نے بھی جس کی تصدیق کی تھی۔ شوکت نے خوب بہت سا لعاب اپنے منہ میں جمع کیا اور پوری طاقت سے پرتاپ کے منہ پر تھوک دیا۔ اسے لگا کہ اس کی پیٹھ سے چپکی خوف کی وہ موٹی چھپکلی ایک بار پھر اس کی کھال سے اپنے پنجے چھڑا کر زمین پر دور جاگری ہے۔ جاتے وقت اس نے پرتاپ کو کہتے سنا تھا۔

"میں بھی تھوکوں گا۔ پر منہ پر نہیں۔"

یہ عید الاضحی کے تین دن بعد کی بات ہے۔ شہباز خاں کے ڈرائنگ روم میں صبح صبح تین افراد اس سے ملنے کے لئے بیٹھے تھے۔

ان لوگوں کا تعلق ایک مسلم محلے سے تھا۔ ان لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بمبئی کے اندھیری علاقے میں مسلمانوں کی ایک کالونی کے کچھ باشندوں نے اپنے ٹی وی سیٹ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دئے تھے تو ان سب نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ وہ بھی اب اپنے گھروں پر ٹی وی نہیں رکھیں گے۔ انھوں نے ٹی وی پھینکے تو نہیں البتہ انھیں اونے پونے بیچ کر وہ سارا پیسہ جو کہ باسٹھ ہزار کے قریب ہو گیا تھا، شہباز خاں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اس رقم کو بے سہارا خواتین کے ہوم میں لگا دیا جائے۔ کالونی کے تین معمر حضرات رومال میں وہ رقم نقد کی صورت میں باندھ کر اپنے ساتھ لائے تھے اور شہباز خاں کا انتظار کر رہے تھے۔ شہباز خان جب مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور انھیں کیفیت معلوم ہوئی تو وہ ٹپٹا کر رہ گئے۔

"ایسا کیوں کیا آپ لوگوں نے۔؟" انھوں نے ایک صاحب سے سوال کیا۔

"ہمارے بچوں کو خراب کر رہا تھا۔؟" جواب ملا۔

"خراب کر رہا تھا۔ ؟کون ؟ٹی وی ؟"

"جی۔" دوسرا بولا۔ 'ان کے شہوانی جذبات کو بھڑکا رہا تھا۔"

"ان میں والدین کے طرف سے بغاوت اور نافرمانی کے جذبات کو جگایا جا رہا تھا۔" تیسرے نے کہا۔

"ہم چاہتے ہیں ہمارے بچے سادگی اور نیکی کے ساتھ جئیں۔" پہلے نے گولی داغی۔ "اور ہماری جوان اور کنواری بیٹیاں وہی کریں جو ہمیشہ کرتی آئی ہیں۔"

شہباز خاں کے منہ سے نکل گیا۔ 'تو پھر آپ ماڈرن کیسے بن پائیں گے ؟۔"

"مطلب۔ ؟" پہلے والے نے جس کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا رومال تھا، بھویں تان کر سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ جو آپ کو آج عصری معنوں میں ہونا چاہئے وہ آپ کیسے بنیں گے ؟"

"آج ہونے کا مطلب اگر بہو بیٹیوں کا اپنے اندام نہانی ماتھے پر چپکا کر گھومنے پھرنے سے ہے تو ایسے ہونے سے نہ ہونا ہم بہتر سمجھتے ہیں۔"

شہباز خاں نے ایک دوبارہ یہ کوشش کی کہ وہ انھیں سمجھائے کہ گھر کا ٹیلیفون بھی آپ کو اچھائی اور برائی دونوں ہی کے ساتھ قبول کرنا پڑے گا۔ غلط نمبر لگیں گے، غلط بل بھی آئیں گے۔ پڑوسی کی کال پر اسے بلا کر بھی لانا پڑے گا اور انجان آوازوں کی فحش گفتاری بھی سننا پڑے گی۔ پھر آپ ٹیلیفون کیوں نہیں اٹھا کر پھینک دیتے۔ اچھا ہو گا اگر آپ نیکی کو اتنا قہار اور جبار نہ بننے دیں۔ لیکن ان لوگوں نے ایک نہ سنی۔ وہ رقم کی باضابطہ رسید فراہم کر کے نکلے ہی تھے کہ کوٹھی کا منحنی سا مالی سارے بدن سے لرزتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ زرد تھا وہ گھٹی گھٹی سی کپکپاتی آواز میں بولا۔

"سرکار باغیچے کے پیچھے ایک بورے میں۔۔۔ بورے میں۔۔۔ بورے میں۔۔' وہ ہکلایا۔

"بورے میں۔۔ ؟کیا ہے بورے میں۔۔ ؟"شہباز گرجا۔

"کوئی لاش ہے مالک۔۔ "بورے کے منہ کے دائرے کو بانس کے ٹکڑے سے کھسکا کر ذرا بڑا کیا گیا پھر اس کے اندر جھانکا گیا۔

وہ ایک کٹی پٹی لاش تھی۔ حلیہ شوکت جہاں جیسا تھا۔ اگرچہ چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔

پولیس کی گاڑیاں، وردی دھاری افسران، رپورٹر، کیمرا مین سونگھتے کتے۔ کئی روز تک شہر

میں سنسنی پھیلی رہی۔ پوسٹ ،ماٹم بیانات، اعلیٰ پولیس افسران کی بیٹھکیں، صحافیوں کی چٹ پٹی رپورٹیں، شہباز خاں کی کئی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ شوکت جہاں کی تصویریں اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ کیچڑ اچھل رہی تھی۔ ماں نے لاش کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

شہباز ہزاروں طرح کے بھیانک وسوسوں میں گھرا ہوا ایک دن سینئر ایس پی سے بولا۔

"دو مہینے ہو گئے۔ کوئی سراغ۔"

"کوشش تو ہو رہی ہے۔"

"قانون کے ہاتھ اگر بندھ نہ جائیں تو سنا ہے کہ لمبے ہوتے ہیں۔"

شہباز کے لہجے کی تلخی کچھ کھل گئی تھی۔ چلتے وقت شہباز خاں۔ ایس ایس پی کے چہرے کو دو پل دیکھتے ہوئے رکا، پھر پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی نظروں میں نظریں ڈال کر اداسی سے بولا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ انصاف نہ ملے؟"

ایس ایس پی نے ایسی کوئی بات نہ پہلے کہی تھی اور نہ اب کہنا چاہتا تھا کہ جو دو ٹوک ہوتی۔ وہ ان کی عزت کرتا تھا۔ اس نے انھیں جو جملہ بڑے بھاری من سے ادا کرتے ہوئے سنا وہ یہ تھا۔

"ایک ہی انصاف اب باقی رہ جاتا ہے۔ اس کا نام ہے POETIC JUSTICE"

شہباز خاں چلا گیا تو اس ایس پی کو خیال آیا کہ اسے اتنا بھی خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ وہ کسی بہانے سے دو تین دن بعد شہباز کی کوٹھی پر گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اپنی بات شہباز کے کان میں ڈال دی۔

"اگر آپ خود کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا قدم ہونا چاہئے جس پر لاکھ چاہتے ہوئے بھی میرا کوئی بس نہ چل سکے۔"

"آپ کا۔۔؟" شہباز نے ٹوکا۔

"مطلب کہ قانون کا۔"

کئی راتوں کی بار بار آوک جاوک کے بعد ایک دن ممو خان پان سے منہ لال کئے۔ ذرا اکڑتے ہوئے اور دل ہی دل میں گنگناتے ہوئے آنکھوں میں کچھ زیادہ ہی چمک کے ساتھ شہباز کے سامنے وارد ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں مسوری سے خریدی گئی جو سبک سے چھڑی تھی اس کو وہ جس

طرح بار بار مختلف طریقوں سے نچا اور گھمار ہے تھے اس سے ان کے دل کی بے چینی کا حال شہباز خاں سے بہتر کوئی دوسرا نہیں بھانپ سکتا تھا۔ ممو خاں کے جبڑے جس تیزی سے ڈلی کے باریک دانوں کو کچل رہے تھے۔ اس سے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ بولنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور وہ بولے

"ہم کھیل کھیلیں گے۔ پالی نہیں چھوڑیں گے۔"

شہباز اپنے قدیم خاندانی دوست کی نس نس سے واقف تھا۔ وہ ممو خاں سے محبت بھی بہت کرتا تھا، اور اس کے کردار کے کھرے پن پر ناز بھی۔ دونوں نے زندگی کے اکثر سرد و گرم ایک ساتھ جھیلے تھے اور ایک دوسرے کے لئے بغیر سوچے سمجھے اوکھلی میں سر دینے کے پرانے عادی تھے۔ شہباز نے مگر اس بار ممو خاں کو ذرا ترشی سے ڈانٹ دیا۔

"ایسے کھیل ہم نے نہ کبھی کھیلے ہیں اور نہ کھیلیں گے۔"

شہباز کے جواب میں چھپی مایوسی کو ممو خاں نے اس طرح جھپٹ کر پکڑ لیا جیسے بندر سانپ کے منہ کو پکڑ لیتا ہے۔ پھر وہ شہباز کے اس جملے کا وہی حشر کرنے لگے جو بندر سانپ کے منہ کو زمین پر رگڑ رگڑ کر کرتا ہے۔ ممو خان کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور اچھل اچھل کر بولتے رہے۔

"بورے میں لاش بھر کر تمھارے کمپاؤنڈ میں ڈالی گئی ہے۔ باہر دیوار کے جس حصے پر چڑھ کر لاش کو اندر پھینکا گیا ہے اور پھر سارے نشانات ختم کئے گئے ہیں۔ اسی میں خاصا وقت لگا ہوگا۔ یہ جوکھم یونہی نہیں لیا گیا ہے۔ چلا چلا کر تم سے کہا جا رہا ہے کہ ہمت ہو تو آؤ بیٹا۔ اس لئے یا تو ابھی، یا پھر کبھی نہیں۔۔ جنگ کسی کے سر پر کیسے تھوپی جاتی ہے، یہ سبق دیا جا چکا ہے، اب ہار ہو یا جیت لڑنا ہے اور وار فیصلہ کن کرنا ہے۔"

"اگر ہم نہ لڑیں تو؟" زبردست ذہنی تناؤ میں یہ جملہ پتہ نہیں شہباز نے کیسے ادا کیا۔

"تو پھر ایک کام کیجئے حضور۔" ممو خاں بھد سے صوفے پر اتنی زور سے گرا کہ اس کے اسپرنگ بول پڑے۔

"آپ ناریل کی موٹی رسی اپنے ساتھ لے کر پرتاپ کے گھر جائیے اس سے کہئے کہ رسی کا پھندا چھت میں لٹکا دے۔ اور جب وہ ایسا کر دے تو جھک کر اسے سلام کیجئے اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں یہ مصرع پڑھئے۔۔۔

باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

اور پھر اسی کے سامنے اس پھندے میں لٹک جائیے۔

"بکواس مت کرو۔" ڈوپل خاموشی رہی۔ پھر مموخاں نے اپنا آخری فیصلہ سنادیا۔

"تم دیکھ لینا۔ آج سے ڈیڑھ سال کے اندر پرتاپ شکلا نہیں رہے گا۔"

مموخان کا چہرہ ڈراؤنا ہو گیا جیسے ان پر آسیب چڑھ آیا ہو۔

"یہ تم کیا بک رہے ہو۔" اس گھڑکی پر مموخاں کا جواب تھا۔

"اگر میں زندہ رہا تو آج سے ڈیڑھ سال کے اندر پرتاپ اس دنیا میں نہیں ہوگا۔" انھوں نے یہ جملہ اس طرح دہرایا جیسے زندگی اور موت ان کی عمل داری میں آنے ہی کو ہیں۔

شہباز نے مموخاں کے چہرے پر ایسی رعونت کی بدرنگی اور چنگیزیت کی ظالمانہ کایا کبھی نہ دیکھی تھی۔ مموخاں سے اس نے کہہ دیا کہ پہلے دن سے ہی وہ بدلے کی آگ میں پھنک رہا ہے، نہاتے میں، کھاتے میں، آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، بس ایک خیال اسے تڑپاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ حکام اور قانون کی سرد مہری جلد ہی شوکت کی لاش کی طرح ہی حرارت اور حرکت سے بے نیاز ہو جائے گی۔

"دیکھو" مموخان نے اسے سمجھایا۔ "میری بات ہو چکی ہے۔"

"کس سے؟"

"میرے سب سے چہیتے دوست سے۔"

"کیسی بات؟"

"یہی کہ مجھے اس حرامزادے کو کیسے ختم کرنا ہے۔"

"کون دوست۔؟" شہباز خوفزدہ ہو کر بولا۔ "خدا کے واسطے اس معاملے میں کسی کو ذرا بھی ہمراز نہ بنانا۔"

"کیا کروں۔؟" مموخاں نے مجبوری ظاہر کی۔ "ساری پلاننگ اسی کی ہے۔ مموخاں کے چہرے پر بڑا اطمینان تھا۔ شہباز اور بھی چڑھ گیا۔

"کون ہے وہ۔" "کیسی پلاننگ؟ یہ ناٹک بازی کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔"

"وہ میرا دوست ہے، میرا ہمدم وہمراز ہے۔ وہ میرا داتا ہے۔ میری عزت اور ناموس، میری شان اور میری جان سب کچھ تو وہی ہے۔ وہ میرے باغ کا سب سے دلار اور آموں کا سرتاج درخت۔ اسی نے مجھے راستہ دکھایا ہے اور اب میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

پھر مموخان نے اس درخت سے ان کی جو رازدارانہ باتیں ہوئیں تھیں اور اس نے

پرتاپ شکلا کو ختم کرنے کی جو پلاننگ ممو خاں کو بتائی تھی اس کا احوال مزے لے لے کر بیان کیا۔

"بھائی ہوا یہ کہ میں اپنے اس دلارے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا تھا اور اسی فکر میں ڈوبا تھا کہ وہ میرے کان میں دھیرے سے بولا۔ میاں معاملہ کیا ہے؟ اتنے فکر مند تو تم جب بھی نہ تھے جب میں آم کی بھری فصل میں ننگا کھڑا تھا۔ تو میں نے اس کو ساری بات بتائی۔ بس سارا ماجرا سن کر وہ چٹ سے بولا۔ میاں آپ بھی کمال کرتے ہو۔ ابھی دو روز بعد آپ میرے تنے کے چاروں طرف تین فٹ اونچی چکنی پولی تھین بندھواؤ گے کہ نہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ پوچھا کیوں؟ میں نے کہا تاکہ بور کو کھانے والے خطرناک کیڑے ملی بگ سے تمھیں بچایا جا سکے۔ تب اس نے سمجھایا کہ تنے کے چاروں طرف چکنی پولی تھین اسی لئے تو باندھی جاتی ہے کہ ملی بگ اس کے چکنے فرش پر چڑھ نہ پائے اور اس طرح تنے سے شاخ اور شاخ سے بور تک نہ پہنچ سکے ور بور اس کے نقصان سے بچ جائے۔ میں نے اقرار کیا کہ ہاں یہی بات ہے۔ تو وہ بولا مگر جب ملی بگ ضد پکڑ جاتا ہے اور پولی تھین کے چکنے فرش کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا دیتا ہے تو اس وقت وہ ننھا سا کیڑا اس درخت کے بور تک حتمی طور پر پہونچ جانے کے لئے کیا کرتا ہے؟ اب ذرا یہ بھی بتاؤ۔ تو میں نے اپنے درخت کو یاد دلایا کہ ایسی صورت میں بہت سے ملی بگ اپنی بال سے بھی باریک ٹانگوں یا پنجوں کو تنے پر بندھی پولی تھین میں گڑو دیتے ہیں، اور وہیں مر جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ پولی تھین کے دونوں کناروں کے درمیان اپنی لاشوں کا پل بنا دیتے ہیں اور ملی بگ کی لاکھوں کی فوج زمین سے اس پیڑ کے تنے پر بندھی چکنی پولی تھین پر اپنے ہم جنسوں کی لاشوں سے بنے ہوئے پل پر ان کو آفریں کہتے ہوئے پہنچ جاتی ہے اور پھر اس پل سے گذرتی ہوئی درخت کے بور پر یلغار کر دیتی ہے۔ یہ سن کر میرے دلارے درخت نے میرے کان میں کہا میاں تمھارے پاس بھی دو چار ایسے ملی بگ تو ہیں ہی جو پل بنانے کے لئے اپنے پنجے گڑو دیں۔ وہ تو دن رات اپنے مالک سے دعا مانگتے رہتے ہیں کہ کبھی تم انھیں اشارہ کرو۔ ان جاں بازوں کی وفاداری کے ٹھنڈے فولاد کو ذرا سا چھو تو دو۔"

اتنا کہہ کر ممو خاں نے شہباز کی طرف ایسے دیکھا جیسے اپنے دلارے درخت کی ذہانت کی داد طلب کر رہے ہوں پھر وہ شہباز کے پاس آئے، شہباز نے دھیرے سے کہا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"تو مت سمجھو۔" ممو خاں بولے۔ "آج سے پرتاپ شکلا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا۔ اور اس سے ہر ملاقات پر اور اس کی ضیافت پر یاددہانی کے طور پر دل ہی دل میں کم

سے کم دو بار دہراؤں گا۔ 'قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ "قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر دنیا سے اٹھ جانا ہے۔"

شہباز کچھ اور بولتا کہ ممو خاں کمرے سے جا چکے تھے۔

ممو خاں دراصل اپنے کو تولنا چاہ رہا تھا۔ صرف شہباز کی دوستی کے لئے ہی نہیں شاید وہ اپنے تلوؤں کے نیچے زمین ٹٹولنا چاہ رہا تھا۔ وہ کہاں کھڑا ہے اس بے لاگ حقیقت سے آنکھیں چار کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنی عزت اور ناموس کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے۔ سانپوں کو پٹارے میں بند کر کے ان کا سر کیسے کچلا جاتا ہے، اس پرانے سبق کو یاد رکھتے ہوئے وہ اپنے کو آزمانا چاہتا تھا۔

پھر ممو خاں روز آم کے ایک گھنے مگر کھلے باغ میں جہاں دور تک آنے جانے والوں پر نظر رہ سکے، چارپائی ڈال کر بیٹھنے لگا۔ چارپائی کے سامنے زمین پر اس کے دو چار ملی بگ بھی ادب سے بیٹھے اپنی سخت اور کھردری ہتھیلیوں پر تمباکو اور چونا مل رہے ہوتے۔ ایک ایک دن کا حساب رکھا جا رہا تھا۔ پرتاپ شکلا سے ایک ایک ملاقات، پھر اس ملاقات میں کہی گئی ایک ایک بات کا ریکارڈ رکھ رہا تھا ممو خاں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بارے میں پرتاپ سے جب بھی جو بھی کہتا اسے شام تک رجسٹر میں نوٹ کر لیا کرتا۔ پھر باغ میں اپنے ملی بگوں کے ساتھ بیٹھ کر پہلے رجسٹر کو الٹتا پلٹتا اور لکھے کو دل میں اسطرح پڑھتا۔

"شکلا جی ایک بات کا افسوس ضرور ہے ہم کو۔ وہ سالا عبدل چکوا اگر ہمارے آدمیوں سے آپ کا نام ہی لے دیتا تو اس کی وہ درگت نہ بنتی۔ وہ سالا ان آموں پر گرا تھا جو ہم روس اکسپورٹ کرتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں شکلا جی آپ، جب بھی اشارہ کیجئے گا، یہ بندہ آپ کے لئے حاضر رہے گا۔ کبھی بھی، کیسا بھی کام پڑے تو یاد کر لیجئے گا۔ بہت بے حیثیت آدمی ہوں، مگر کلہاڑی کے دستے کی طرح! وہ حقیر دستہ نہ ہو تو کلہاڑی کام نہیں کر پاتی۔"

"فصل آنے تو دیجئے حضور جس باغ کے آم کی فصل کے لئے حکم کیجئے گا وہ آپ کے قدموں میں ہوگی۔ وہی نہیں پورا جشن منایئے گا، پورے انتظام کے ساتھ۔ دن کا بھی رات کا بھی۔ انتظام ہوگا تو پھر ویسا ہی ہوگا کہ آپ کے غلام تک جھوم اٹھیں۔"

ایک جگہ اس رجسٹر میں مموخاں نے یہ بھی لکھا تھا۔

آج شکلا (پرتاپ شکلا) سے ملاقات ہوئی۔ کوئی قابل ذکر بات تو نہیں ہوئی لیکن میں چلتے وقت اسے دیکھ کر اپنے دل میں وہ جملہ دوبار دہرانا بھول گیا جو ہمیشہ دہرایا کرتا تھا۔۔ ارے وہی۔ ”قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر اس دنیا۔۔۔“ جی چاہتا ہے اپنے منہ پر طمانچے ماروں۔

مموخاں کے ملی بگوں میں سب سے زیادہ جہاندیدہ اور چالاک آنکھوں والے اور بھوری مونچھوں والے اور مضبوط بازووں والے تند گفتار ملی بگ کو اس بور کی خوشبو سنگھائی جاچکی تھی جس تک اس ملی بگ کو پہونچنا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں سے ایک کو پڑوس کے گاؤں کی ایک ایسی چھنال کو لے کر آنے کے کام پر بھی لگا دیا تھا جو تھی تو پاسی برادری کی ہی لیکن پنچایت کے ذریعہ نکالی جاچکی تھی۔ اس تند گفتار ملی بگ نے مموخاں کو آگاہ کر دیا تھا۔

”مالک! اس کتیا کے دانت نوکدار ہیں اور کمر کی بھی مضبوط ہے۔ بالکل تیر کمان ہو رہی ہے۔“

قدرت اللہ بنن کے بہیمانہ قتل کے بعد سے چپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اکثر نمازیں وہ با جماعت پڑھتا۔ اس کا بڑا بیٹا بھی ان دنوں آئے دن بیمار رہنے لگا تھا۔ تنگ دستی کی یوں تو اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔ لیکن بنن کا ماتم بھی جی کھول کر نہ کرپانے سے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ تنگ دستی خوشی ہی نہیں غم کے منانے میں بھی ہارج ہو جاتی ہے۔ اخبار کا عملہ اس قدر مختصر تھا کہ چار چار لوگوں کے کام اور بھاگ دوڑ کو وہ اکیلا سنبھالتا تھا۔ بنن مری تو بھی وہ تین دن سے زیادہ کا سوگ نہیں منا سکا۔ کہ اخبار کو وقت سے نکلنا تھا۔

شب برات کے ایک دن پہلے دفتر میں قدرت نے قدم رکھا ہی تھا کہ کسی پارٹی ورکر نے فون کا چونگا اسے پکڑا دیا۔ لائن پر پرتاپ شکلا تھا۔

”شب برات میں قبرستان پر میلہ رہتا ہے۔ کیا میں بھی قبرستان چل چکتا ہوں۔ قبر پر

ایک موم بتی جلانے۔"

"جلادیجئے۔" قدرت نے کہہ دیا۔

وقت مقررہ پر عشا پڑھ کر قدرت اللہ نکلنے کے لئے تیاری کر ہی رہا تھا کہ پرتاپ شکلا کی گاڑی آگئی۔ قبرستان کے باہر سینکڑوں محتاج اور فقیروں کی بھیڑ بھڑ کے سے ہوتا ہوا جب پرتاپ شکلا شوکت جہاں کی قبر تک پہونچا تو اس نے دیکھا کہ ہر قبر پر دور دور تک اگر بتیاں اور موم بتیاں جل رہی ہیں۔ قدرت فاتحہ پڑھ رہا تھا کہ پرتاپ شکلا نے قبر کی مٹی پر موم بتی گاڑ کر جلائی اور قبر کو گھورنے لگا۔ اسی وقفے میں وہ دل کے کسی گاشے میں شوکت جہاں سے مخاطب تھا۔

"کتنا سمجھاتا تھا تم کو کہ بھگوان کے لئے تم مت مرو۔ دوسروں کو مرنے دو۔ اب دیکھو، اپنی زیادتی دیکھو اور خود سوچو۔۔ تمھارے لئے بس ہمیں رہ گئے تھے اپنی پارسائی کا ڈھونگ دکھانے کے لئے۔ میں بھی کیا کرتا؟ تم نے میرے منہ پر تھوکا۔ میں نے۔۔۔"

پرتاپ شکلا نے دیکھا، ہوا کے جھونکے سے اس کی موم بتی بجھ گئی تھی۔ اس نے جھک کر ماچس کی تیلی سے پھر اسے جلادیا۔ اس کے دل کے پھر اسی گوشے سے آواز اٹھی۔۔۔

"تم کہاں کہاں جاتی تھیں، سب پتہ رکھنا پڑتا تھا ہمیں۔ وہ کیسریا رنگ کی کوٹھی، ارے وہی شہباز خاں، جو مسلمانوں کا چودھری بن کر راج نیتی میں آنے کا لنگوٹا باندھ رہا ہے۔ سالا زنانہ۔"

پرتاپ کو یقین تھا کہ شہباز اسے اپنے آدمیوں کے ذریعہ روز رات گئے فون کرواتا تھا اور فون پر وہ گندے اس کی ماں بہن کو پنتے تھے۔ کئی کاریہ کرتاؤں نے یہ شکایت پرتاپ سے کی کہ شوکت آر ایس ایس کی ایک سیویکا کے سنگ بھی دیکھی جاتی ہے۔ پرتاپ تو بہت خوش ہوا تھا یہ سن کر شوکت کی اس پرچار کا سے دوستی کو وہ اپنی لابی میں کافی اچھال بھی چکا تھا۔ پرتاپ قبر کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اگر تم زندہ رہتیں تو تمھیں یہ بات جان لینے میں دیر نہ لگتی کہ راج نیتی والوں کے سچ جیون کی سچائیوں والے سچ سے پرے ہوتے ہیں۔ پرتاپ شکلا کی موم بتی پر نظر پڑی۔ وہ پھر بجھ گئی تھی۔ وہ جھکا، ایک بار اسے پھر جلایا اور ہونٹوں پر کڑوی سی غیر محسوس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔۔" ضدی بہت تھیں، اب اکھاڑ لو اس دنیا کا جو تم سے اکھاڑتے بنے۔"

پرتاپ کی جلائی ہوئی موم بتی ایک دم سے پھر بجھ گئی۔

شب برات کو دو چار روز ہی گزرے تھے کہ قدرت اللہ کا اردو میں چھپنے والا پارٹی آرگن پریس سے آگیا۔ اخبار جب پارٹی کے سربراہوں کے ہاتھ میں پہونچا تو قدرت اللہ اس کمرے میں ایک بار پھر طلب کئے گئے جہاں تین لوگ گردن اکڑائے بیٹھے تھے اور درمیان میں بیٹھنے والے کے گلے میں نواڑ سے کچھ زیادہ چوڑی غالباً دو تہوں میں پریس کی گئی کوئی رنگین پٹی پڑی تھی۔ ان کے سامنے میز پر تازہ اخبار پڑا تھا جس کی ایک عبارت کو لال روشنائی سے گھیر اگیا تھا۔

جو درمیان میں بیٹھا تھا وہ تو چپ رہا۔ بائیں طرف والے نے بات شروع کی۔

''آپ انھیں کب سے جانتے ہیں؟''

قدرت اس غیر متوقع ادھورے سوال پر ٹپٹا گیا۔

''ودھایک پرتاپ شکلا کو۔''

''بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ والد صاحب کے زمانے سے سمجھئے''

''انھوں نے کبھی یہ چاہا کہ آپ ہمارے اخبار کے ذریعہ مسلمانوں میں ان کے دھرم کے پرتی انقلابی بھاؤناؤں کو جگائیں۔؟''

''انھیں ہمارے اخبار سے کیا لینا دینا؟'' قدرت نے جواب دیا۔

جو آدمی درمیان میں اپنی گردن میں رنگین پٹا ڈالے بیٹھا تھا اس نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں نرمی سے سوال کیا۔

''آپ انگریزی جرنلسٹ سعید نقوی کے کالم پڑھتے رہتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا کرتے ہیں۔'' وہ نرمی سے بولا۔ ''سعید نقوی کے کالم سے یہ عبارت آپ نے ہی نکالی ہے؟'' اس نے لال روشنائی کے گھیرے میں لکھی عبارت کی طرف اشارہ کیا۔

''جی ہاں۔'' قدرت نے حامی بھری۔

''انگریزی سے اردو میں انواد بھی آپ نے ہی کیا ہے؟''

''جی۔''

''ذرا پڑھ کر سنایئے۔'

قدرت اللہ نے پڑھنا شروع کیا۔۔۔

لیبیا میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی تنظیمی اور باضابطہ بچولیا مقرر نہیں ہے۔ مولانا

ناموجود ہے۔ جمعہ کا خطبہ کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی جیسے ڈاکٹر وغیرہ پڑھ دیتا ہے۔ وہاں خواتین کے لئے ہر لحاظ سے مکمل فوجی اکادمی بھی ہے۔۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ (اب) تک ہندوستان کے مسلمان یہ طے نہیں کرپائے کہ عید یا محرم (کا تہوار) کس دن منایا جائے۔ جب کہ لیبیا میں ترپولی یونیورسٹی کا شعبہ فلکیات و نجوم بہت پہلے ہی یہ اعلان کر دیتا ہے کہ نئے ہلال کی رویت کس تاریخ کو ہوگی۔

قدرت اللہ نے عبارت ختم کر کے سانس لی۔ وہ تینوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"کیا یہ ٹھیک ہے؟" پٹے والے نے سوال کیا۔

"کیوں؟ اس میں کیا غلط ہے؟" قدرت بولا۔

"بس ایک بات غلط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"چیزوں کو اپنی نظر سے دیکھئے۔ اگر سعید نقوی کی نظر سے دیکھنا ہے تو آپ کی جگہ انھیں بٹھایا جانا چاہئے۔"

پھر چپراسی چائے لے کر اندر آیا۔ چائے کے دوران اسے بتلایا گیا کہ مسلمان ہماری ذرا سی انگلی سے بھی اچھل پڑتا ہے اس لئے اس کے بارے میں لکھنا ابھی ضروری نہیں ہے۔ بھارت ویسے بھی لیبیا نہیں ہے۔ یہاں کے مولوی کے ساتھ فوٹو کھنچوا کر اخباروں میں ایک سیاسی محاورہ تیار کیا جاتا ہے جس کے کچھ خاص مطلب ہوتے ہیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں۔" قدرت جھلا کر بولا اس نے جھٹکے سے کرسی چھوڑی، باہر کے دروازے کی چق اٹھائی اور نکل گیا۔۔ وہ تیسری بار دفتر سے روٹھ کر گھر بیٹھ گیا تھا۔

ابھی مشکل سے تین روز ہی گزرے تھے کہ دفتر کا آدمی اسے بلانے آگیا۔ وہ سنچالک جی کا پرچہ بھی ساتھ لایا تھا جس میں خاص طور پر اسی کے فائدے کی بات کہی گئی تھی اور اسے دفتر بلایا گیا تھا۔ ایک بار تو قدرت کے جی میں آئی کہ وہ نہ جائے لیکن وقت آنے پر وہ پھر چلا ہی گیا۔

تین لوگ کرسیوں پر گردن اکڑائے بیٹھے تھے۔ لیکن کمرے میں قدرت کے داخل ہونے پر گردن میں پٹا لٹکا کر بیٹھنے والا کچھ زیادہ ہی لچیلا اور نرم نظر آرہا تھا۔ بات اسی نے شروع کی۔

"آپ کی بہن کے دردناک قتل کے وشے میں کیا کچھ آگے پتہ چلا؟

''جی نہیں۔۔''قدرت نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

''اخباروں میں پرتاپ شکلا کا نام کچھ چرچا کا وشے بنا تھا اس معاملے میں۔'' دوسرا بولا۔

''کیا آپ کا بھی ایسا ہی خیال ہے؟'' تیسرے نے سوال کیا۔

''کیا کہا جاسکتا ہے؟'' قدرت نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ہم آپ کی تنخواہ ڈیوڑھی کئے دے رہے ہیں۔'' بیچ والے نے کہا۔

''آپ کی موپیڈ کے لئے پیٹرول الاونس بھی دیں گے۔'' داہنی طرف والا بولا۔

''آپ کا کمرہ، آپ کی میز فرنیچر اور دوسرا ٹیم ٹام بھی اب قاعدے کا کیا جارہا ہے۔'' بائیں طرف والے نے بتایا۔ پھر بیچ والے نے قدرت کو بتایا کہ پرتاپ شکلا کے سارے بیانوں کو قدرت اخبار میں نمایاں طور پر چھاپے گا۔ اس کے خلاف چھپنے والے بیانوں کی کاٹ کرے گا اور ان پر گہری نظر رکھے گا۔

''لیکن وہ آپ کی پارٹی کے تو ہیں نہیں۔'' قدرت چونک کر بولا۔

بیچ والا قدرت کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔ ''میاں کون کس پارٹی میں ہے یا نہیں ہے اور اگر ہے تو کیوں ہے؟ اور پارٹی کا نہ ہوتے ہوئے بھی کیا وہ پارٹی کا ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو کتنا؟ اور جتنا ہو سکتا ہے اس میں کتنا فائدہ ہے اور کتنا نقصان، اور نقصان ہے تو اس نقصان کو آگے اور کتنے دن اٹھایا جاتا رہے کہ اس کا فائدہ حاصل ہو سکے اور اس فائدے کا کچھ وزن بن سکے اور پھر اس وزن کو اپنے پلڑے میں کیسے لایا جائے اور اپنی طرف نہ لا پانے کی صورت میں کب تک انتظار کیا جائے اور انتظار کی وہ مدت گزرنے پر حالات کو نئی ضرب تقسیم اور جوڑ گھٹاؤ کے مطابق کیسے آنکا جائے۔ یہ سب باتیں ہمارے طے کرنے کی ہیں کہ ہم یہاں جھک مارنے کے لئے نہیں بلکہ اسی کام کے لئے بیٹھے ہیں۔'' یہ کہہ کر بیچ والا کرسی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔۔ بائیں طرف والے نے قدرت کو ایک کاغذ تھما دیا اور بولا۔۔۔ ''یہ کاغذ اپنی میز کے شیشے کے نیچے لگا دینا تاکہ اس کی عبارت پر ہمیشہ نظر رہے۔ اگر اب تم روٹھ کر گھر بیٹھو گے تو ہم تمھیں منانے نہیں آئیں گے کمر پر دولات مار کر نکال باہر کریں گے۔۔'' پرچے پر لکھا تھا۔

''سیاست میں ہمارا کام یہ تلاش کرنا نہیں کہ سچ کیا ہے؟ ہمارا کام یہ تلاش کرنا ہے کہ وہ سچ کیا ہے جو ہمیں درکار ہے۔''

اس دن جب بجلی واپس آجانے پر بھی قدرت کے کمرے کا اندھیرا واپس نہیں آیا تو

قدرت اس بچ سے نہیں لڑ رہا تھا جو اسے میز کے شیشے کے نیچے رکھنے کو کہا گیا تھا۔ وہ لکھنا چاہتا تھا، ہندو نے اردو کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی معمولی ذاتی کی ہو لیکن اردو کے اندر جو مکڑے ہیں انھیں صاف کرنے اب سر سید قبر سے نہیں اٹھے گا۔ قدرت نے عربی فارسی اور اردو پڑھنے میں آنکھیں پھوڑیں، انگریزی زبان اور ادب کی جستجو میں ٹھوکریں کھائیں، گھر سے بھاگا، اخباروں کے کالم معمولی عیوضی پر بھرتا رہا اور اسی کے گھر کے سامنے اردو کا پروفیسر اسحاق ہے، بچپن جس نے اغلام بازوں کی صحبت میں گزارا اور جسکی ہاف پینٹ آج بھی داغدار حالت میں عدالت میں جمع ہے، اسحاق شعر و ادب کے جلسوں میں پیٹھ کے پیچھے گاؤ تکیہ لگا کر جلسہ ختم ہونے تک سوتا ہے، جن جلسوں میں لنچ یا ڈنر کا انتظام بھی ہو وہاں سب سے پہلے پہنچتا ہے اور اس بات سے ہمیشہ ناخوش رہتا ہے کہ کھانا جلسے کی کاروائی کے بعد کیوں کھلایا جاتا ہے۔ ایک دن قدرت نے اس سے یہ جاننا چاہا تھا کہ اگر اسکے حوالے کوئی اردو اکادمی کر دی جائے تو وہ زبان و ادب کی خدمت کے لئے کیا کرے گا، اسحاق کا خیال تھا کہ اب اردو کے لئے کچھ کرنے کو باقی ہی کیا بچا ہے جو کیا جائے۔

کمرے کے ایک کونے پر قدرت کی نظر پڑی اور دیر تک ٹکی رہی۔ ایک مکڑا جالا بن رہا تھا، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مکڑے کبھی مرتے نہیں، کہیں نہ کہیں کسی کونے سے پھر نکل آتے ہیں کہ لڑائی باہر ہی نہیں اندر بھی ہے۔

قدرت کو حالات نے اسحاق کی جانب سے یہ یقین دلا دیا تھا کہ اسحاق پڑھانے کے علاوہ باقی سارے کام کرتا رہا ہے۔ طبقہ اشرافیہ اور اعلیٰ نسل کے اردو کے ادیب اور ناقد پروفیسر اسحاق سے اردو کی دنیا میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اب وہ کام بھی لینے لگے ہیں جو ممو خاں کے گھر میں پلی ہوئی بہ ظاہر معصوم سی بطخیں کیا کرتی ہیں۔

ممو خاں نے اپنے صدر دروازے پر ایک تختی لگا رکھی ہے جس پر لکھا ہے۔

"ہماری بطخوں سے ہوشیار۔ یہ قیں قیں کر کے اندر کھلے کتوں کو ہوشیار کر دیا کرتی ہیں۔"

(۱۴)

ابھی سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ آم کے باغوں میں پہلے بور آئے، پھر کیریاں آئیں۔ پھر آندھیوں نے زور مارا، پھر بادل اٹھے اور پھر ممو خاں کے باغوں میں جھولے پڑ گئے۔ انھیں

جھولوں کے پاس شاندار آم بھی شاخوں میں جھولا جھولنے لگے۔ یہ اس رات کی بات ہے جب ممو خاں کی نئی نرسری سے بس ڈیڑھ کیلو میٹر دور پی ڈبلو ڈی رسٹ ہاؤس کی تنہا عمارت بوڑھے سرکاری خانساماں اور ادھیڑ عمر کے چوکیدار اور پرتاپ شکلا کے کم عمر ڈرائیور کے علاوہ بھی چند کارندوں کی آماج گاہ تھی۔ خانساماں تو اپنی کوٹھری میں اپنی مدقوق عورت کے ساتھ بند تھا۔ دن میں کئی بار وہ بوندا باندی میں بھیگ چکا تھا۔ پرتاپ شکلا اور اس کے مہمانوں کے سلسلے کی ضیافت میں وہ ابھی شام چڑھے تک بہت مصروف رہا تھا۔ شام کو آم پارٹی کے برتن دھونے کے لئے تیر کمان چھاتیوں والی بھی کارندوں میں شامل ہو چکی تھی۔۔ جب گہرا اندھیرا چھایا، گہری خاموشی نے بھائیں بھائیں کرتی سرگوشی میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں کچھ کہنا چاہا تو رسٹ ہاؤس کا دن بھر کا تھکا چوکیدار سائبان کے نیچے پرتاپ شکلا کی گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ دیسی دارو کا ادھا اور بیڑی کا بنڈل لے کر بیٹھ گیا۔ شام کی چائے کی میز پر سے ہٹائے گئے آلو کے چپس بھی دو مٹھی سامنے رکھے تھے۔

عمارت کے پیچھے ہائی ٹینشن لائن لگی ہوئی تھی جس کے موٹے موٹے برقی تاروں سے بارش کی موٹی موٹی بوندیں اب بھی ٹپک رہی تھیں۔

رسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر ایک میں ایک مسہری تھی، مسہری پر مچھر دانی تھی، مچھر دانی میں پرتاپ تھا، پرتاپ کے ہاتھ میں گلاس تھا، گلاس میں امپورٹڈ وہسکی تھی۔ کمرے سے ملحق باتھ روم کا بلب جل رہا تھا۔ اندر سے اس نے دروازے کی سٹکنی نہیں چڑھائی تھی کہ کبھی کبھی وہ کمرے سے باہر برآمدے میں آکر اپنا ایک ہاتھ باہر کھلے آسمان کے نیچے نکال کر اپنے ہاتھ پر بارش کو محسوس کرتا تھا اور گنگناتا تھا۔

"ڈاکا تو نہیں ڈالا۔۔ ڈالا۔۔ ڈاکا تو نہیں، چوری تو نہیں کی ہے۔"

پھر وہ اونچی آواز میں پکار کر کہتا۔

"چوکیدار، کرسی باہر لگاؤ۔ ہم باہر بیٹھیں گے۔"

مگر آواز پر نہ چوکیدار آتا نہ کرسی باہر لگتی۔ وہ بھی اپنے دئے گئے حکم کی تعمیل کا انتظار کئے بغیر پھر اپنے کمرے میں گھس جاتا۔

وقت دھیرے دھیرے دبے پاؤں کسی شاطر جنگلی شکاری کی طرح دبک دبک کر آگے بڑھ رہا تھا۔

"میرے للی بیگ۔۔" ممو خاں نے بڑبڑاتے ہوئے ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ اس نے اندر

سے بڑی کھڑکی کے شیشوں پر فلمی منظر کی طرح کسی پرچھائیں کو دیکھا اور آہستہ سے کھڑکی پر آیا۔ ذرا سا پٹ کھولا اور دھیمے سے پکارا۔

"چھیدا۔"

"سرکار۔"

"کیا بات ہے۔؟"

"آشیر باد چاہی، حکم ہوئے جائے۔"

"جاؤ۔"

سایہ باہر کسی اندھیرے میں کھو گیا۔ ممو خاں نے حساب لگایا۔ لگ بھگ بائیس ہزار روپے گیارہ مہینے اور انیس دن میں پرتاپ شکلا کو صرف دوست بنانے کے پروجیکٹ پر خرچ کئے جا چکے تھے اور اس عرصے میں وہ کم سے کم پچاس ساٹھ بار پرتاپ سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنے دل میں دہرا چکا تھا۔

"قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر اس دنیا سے اٹھ جانا ہے۔"

کتنے دعوے کرتا ہے آدمی، ممو خاں نے سوچا لیکن کتنا کمزور ہے آدمی، موت ہر دم اس کی رگ جاں سے کتنی قریب بیٹھی رہتی ہے۔ ممو خاں تم اس کتی چیز سے جسے موت کہتے ہیں کبھی مت ڈرنا۔

"رسٹ ہاؤس کے لان اور باغیچے میں ملی بگ پہونچ گئے تھے، کہیں کوئی مزاحمت نہ تھی۔

"دروازہ لاک مت کیجئے گا۔" پرتاپ سے کہا گیا تھا۔

"کیوں؟" پرتاپ نے جاننا چاہا تھا۔

"کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ویسے دروازے کے لئے آپ کو خان صاحب نے کچھ بتلایا نہیں تھا کیا؟"

"پرتاپ نے کچھ دیر سوچا تھا۔ پھر جیسے اسے یاد آ گیا تھا۔ "اچھا ہاں! ٹھیک ہے۔ ذرا جلدی بھیجنا۔"

اور وہ آٹھ بجے کے آس پاس ہی اس ہلکی بوندا باندی میں کچھ بھیگے اور کچھ سوکھے بدن کے ساتھ اندر پہونچا دی گئی۔

"رسٹ ہاؤس کے برآمدے کے کھمبوں کی آڑ میں کھڑے ملی بگوں میں سے ایک ملی بگ کی شادی مہینہ بھر پہلے ہی پنچوں نے اجازت نامہ دے کر اس تیر کمان چھاتیوں والی پاسن سے

کرائی تھی کہ یہ بھی اس خونی ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔

اندر عورت نے پرتاپ کے سامنے اپنا بدن کھولنے سے پہلے ٹٹھول کر کے اور ہنس ہنس کر خوب دھینگا مشتی کی، اپنے بٹن تڑوائے۔ ازار بند میں پہلے سے لگائی گئی دو دو گانٹھوں کو پرتاپ کھولنے چلا تو بولی

"توڑ دے نا۔"

جب اس کا سارا بدن کھل گیا، اور پرتاپ کا بھی بدن کھل گیا تو عورت نے اپنی دونوں باہوں میں اس کی کمر کو لے کر چلانا شروع کیا۔ سب سے پہلے چوکیدار اور ڈرائیور آئے۔ پرتاپ کے کمرے کے اندر سے عورت کی چیخیں صرف سنی جا سکتی تھیں، کیونکہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ پہلے تو انہوں نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ پھر وہ دونوں تیزی سے عقب میں گئے۔ کمرے کی کھڑکی کو دھکا دیا تو وہ کھل گئی۔ دیکھا ایک عورت برہنہ حالت میں، ننگے بدن پرتاپ سے لپٹی چلا رہی ہے۔ اسی وقت کہیں سے اس کھڑکی پر عورت کا شوہر بھی آ گیا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے مبہوت سا ایک پل منظر کو دیکھتا رہا پھر دیوانوں کی طرح چلایا۔۔

"حرامزادی، نٹی کاٹ لے دانتوں سے۔" دارو پرتاپ کی آدھی سدھ بدھ لے چکی تھی، عورت نے غرا کر سامنے والے سارے دانت پرتاپ کے نرخرے میں اتار دیئے۔ پھر لوگوں نے بھی دیکھا، کھلے بالوں والی، ماتھے پر پھیلی سی سندروی بندیا والی اور بے کپڑوں کے بدن والی ایک دہقان عورت اپنے چہرے کو پرتاپ کی گردن پر سے اٹھا رہی ہے اور اس کے دانت ناک اور تھوڑی اس بلی کی طرح لال ہیں جس نے تازہ تازہ کبوتر کھایا ہو۔

علاقے کے حولدار نے چپٹی سلاخ اندر ڈال کر سٹکنی اکسا کر دروازہ کھلوایا، عورت کو آس پاس کی کوئی سدھ نہ تھی بس ایک طرف پلکیں جھپکائے بغیر دیکھے جا رہی تھی۔ شوہر نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی دھوتی کھول کر اس کا بدن ڈھانپا تب تک پرتاپ کے چہرے پر آخری کرب کے گہرے نشانات بھی اپنی جگہ ٹھہر کر جم گئے تھے۔

(۱۰)

موسم آ رہے تھے اور موسم جا رہے تھے۔ ممو خاں اپنے ملی بگوں کی قانونی پیروی بھی کرتا جاتا تھا اور آندھیوں کے ذریعہ کی گئی فصل کی بربادی پر آسمان کو مغلظات بھی سناتا جاتا تھا۔

شوکت جہاں کے لئے شہباز کے دل میں کہیں کوئی ہلکی سی چاپ جو سنائی دی تھی اسے لگا کہ وہ کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ آ بھی رہی تھی یا نہیں؟۔

"مجھے وہاں سے نکال لیجئے شہباز صاحب" شوکت گڑگڑاتی تھی۔

شہباز کروٹیں بدلتا تھا، بڑبڑاتا تھا اور کبھی کبھی اپنی بے بسی بھری تنہائیوں میں دیواروں کے درمیان مٹھیاں بھینچ کر کہتا تھا۔

"اپنی اپنی زندگی کے چلن کے ہاتھوں اپنی اپنی موتیں گروی کر دیتے ہیں سب۔ پھر کون کس کو نکال پاتا ہے؟ پھر یہاں سے نکل کر وہاں بیٹھ جاؤ تو بھی کیا ہوگا؟۔ بدلے ہوئے آسیب، بدلی ہوئی جنگ۔" شہباز کو لگا کہ کوئی اس کے کانوں میں بار بار سوال کرتا ہے۔

"وہ کیا ہے؟"

"وہ، جو ہمارے "ہم" سے بھی آگے آگے چلتا ہے۔

"کیا ہے۔ کوئی بتاؤ"

ممو خان حقے کی نال منہ میں دبائے راٹھور کے ساتھ شطرنج کی بساط پر جھکے ہوئے تھے۔ تب ہی راٹھور ممو خان کے نئے شکار دلاور باغبان کی سینہ کوبی کی اصلیت کو کریدنے کے لئے اپنے دل میں سوالات کے مہرے بھی بچھاتا جا رہا تھا۔ کیونکہ پوری بستی میں دلاور کے سارے باغوں کی پر اسرار طریقے سے فصل برباد ہو جانے کے بڑے چرچے ہو رہے تھے۔

ممو خاں نے یہ بات بھانپ لی۔ بولے۔

"تم سوچ کیا رہے ہو؟ کہیں اور دماغ ہے تمہارا کیا۔؟"

"ہاں ہے تو۔" راٹھور کو سر امل گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو"

"سوچ رہا ہوں کہ تم نے بہت دنوں پہلے قرآن کی قسم کھا کر مجھے بتایا تھا کہ تازہ فصل میں دلاور کے درختوں میں ایک پھل بھی نہیں ملے گا۔ بتایا تھا نا؟"

"ہاں تو کیا جھوٹ بتایا تھا؟" ممو خاں گرجا۔ "تم اندھے تو ہو نہیں، دیکھ نہیں رہے کہ اس کے سارے باغ بے ثمر کھڑے ہیں، دوا کے لئے بھی ایک کیری نہیں۔"

"دیکھ رہا ہوں" راٹھور چال چلتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "لیکن تمہارے کون سے کتے پنے کی وجہ سے دلاور کا یہ حشر ہوا، بس یہی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اس میں سمجھنے سمجھانے کی کونسی بات ہے۔" ممو خاں نے اپنی ران کھجاتے ہوئے تہد ذرا اوپر کر لی۔ "جتنی بار دلاور سے ملتا تھا بس دل میں ایک بار وہی بات دہرالیا کرتا تھا۔"

"کون سی بات؟"

"قسم قرآن کی دلاور خاں اگلی فصل میں تیرے باغوں میں ایک امبیا بھی نہیں لگے گی۔"

"میں تجھے پھانسی تھوڑی چڑھوادونگا۔ مجھے تو صحیح صحیح بتادے یار۔"

راٹھور گڑگڑایا۔ ممو خاں کو پھانسی چڑھوانے والی بات چھوٹا منہ اور بڑی بات لگی۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"تو سنو۔" ممو مہرا پیٹتے ہوئے غصے سے بولا۔ "جا کے اس پسو کی اولاد سے بتادو کہ اس کے باغ ہمارے ملی بگوں نے اجاڑے ہیں۔ اس کی بوروں پر غلط پسٹی سائڈ (PESTICIDE) چھڑک کر۔"

"غلط پیسٹی سائڈ؟"

"بور آنے پر انھیں خطرناک کیڑوں سے بچانے کے لئے آلے کے ذریعے پیسٹی سائڈان اسپرے کیا جاتا ہے۔" ممو خاں نے اسے سمجھایا۔ "بس وہ پیسٹی-سائڈ بدلوادیا تھا ہم نے! سارا بور مر گیا۔ کیسے بدلوایا تھا، یہ ہم اپنے باپ کو بھی نہیں بتائیں گے۔ چال چلو۔"

"اور راٹھور کھلے منہ سے پہلے دو پل ممو خاں کو دیکھتا رہا پھر چال سوچنے میں لگ گیا۔ پھر ایک دم سے اچھل کر بولا۔ "کیا آدمیوں کو بھی کیڑا لگ جایا کرتا ہے؟

"ہاں۔" ممو خاں بولا۔ "پوری پوری قوموں میں کیڑا لگ جایا کرتا ہے۔ پوری نسل تباہ ہو جاتی ہے۔"

"تو آدمیوں پر چھڑکنے والا کوئی آلہ، کوئی پیسٹی سائڈ نہیں ہے کیا؟"

"ہے۔ بالکل ہے۔" ممو خاں بہت سنجیدگی سے بولا۔ "اور تیر بہ ہدف ہے۔ کیا مجال جو کام نہ کرے۔"

"مذاق نہ کرو۔ سچ بتاؤ۔"

"میں سچ بتا رہا ہوں۔" ممو خاں بولا۔

"کیا ہے ؟" راٹھور نے بچوں کی طرح گہری دلچسپی ظاہر کی۔ ممو خاں نے عجب سا اشارہ کیا۔ "یہ رہا۔"

"تم ایک نمبر کے کمینے ہو" راٹھور اچھلا۔ وہ ویسے ہی مات کھانے والا تھا، اس لئے اس نے مہروں پر ایک ہاتھ مار کر انھیں تتر بتر کیا اور ممو خاں کو گالیاں دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس دن تنہائی میں ممو خاں نے خود سے ڈھیر ساری باتیں کیں

ممو خان، ولد رافع خاں، ولد تاج الدین خاں باغ والے، آپ کے حقے کی چلم اور چلم پر رکھی تمباکو اور تمباکو پر رکھا مٹی کا چھوٹا سا توا اور توے پر رکھے انگارے اب اتنی گرمی میں بس گئے ہیں کہ کش کھینچنے پر بڑا گاڑھا اور مست کر دینے والا دھواں نکلے گا۔ اس لئے لمبا کش لیجئے، راٹھور کی چال پر سوچئے اور رہاتی عیش کیجئے۔ ایک زمین اور اسکا مٹھی بھر آسمان اور اس آسمان کے نیچے آباو اجداد کا بنوایا لکھوری اینٹوں کا یہ کھلا کھلا سا گھر، کچھ پیڑوں کے باغ اور مٹی کی ہی مہربانی سے دئے گئے کچھ پھلوں کے ساتھ آپکی قسمت مُہر بند کر دی گئی ہے۔ آپ کو دس پندرہ سال اور جینا ہے، یہ زندگی ہی ٹرافک سے بھری بُری ایک سڑک ہے۔ جیسا پہلے کرتے رہے اب بھی کیجئے، نہ کچھ بدلا ہے اور نہ بدلے گا، اگر کچھ بدلے گا تو اس بدلے ہوئے کو بدلنے کے لئے کوئی بدل تیار ہو جائے گا۔ بس بچ بچ کر چلتے رہئے چاہے داہنے یا بائیں یا درمیان۔ اگر کسی لڑائی میں جیت جائے تو آنے والی ہار پر رنجیدہ ہونے کا حساب برابر کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو خوش ہو لیجئے۔ کم اور زیادہ کے معاملات میں نہ آپ کے باپ پڑے اور نہ دادا، وہ بھی باغبان ہی تھے آپ بھی باغبان ہیں۔

کیا آپ کو اور زیادہ باغ چاہئے ؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اور زیادہ باغ آپ کو مل جائیں، لیکن دوسروں کے پاس آپ سے اور زیادہ جو باغ ہیں اور جنکے بستر آپ کے بستر سے زیادہ آرام دہ ہیں، اور جنکی راتیں آپ کی راتوں سے اور زیادہ روشن ہیں اور جنکے دستر خوان آپ کے دستر خوان سے زیادہ لذت بخش ہیں انکے پاس اتنے ہی خوف، اتنے ہی وسوسے، راتوں کی اتنی ہی بے چین کر دینے والی بے خوابی اور لمبے لمبے دنوں میں لمبی لمبی دم پھلا دینے والی دوڑ بھاگ بھی ہے۔ اس لئے جناب ممو خاں صاحب اپنے حقے کا دوسرا کش لیجئے، پھیپھڑوں میں خوب بہت سا دھواں بھر کر ہوا میں چھوڑئے پھر ہلکا سا کھانسئے اور اسکے بعد اس بات کو یاد رکھئے کہ خدا کے اس بے انتہا آسمان کے نیچے

کیڑوں کی طرح رینگتے یہ انسان ایک نمبر کے۔ ننچے اور کمینے ہیں، !انھیں اور زیادہ بُرا کہنے کو دل چاہے تو یہ بھی کہیئے کہ یہ ساری پچھلی کی گئی نیکیوں میں آگ لگانے، فتوحات کو دھول چٹانے اور اقبال مندیوں کو اوندھے منہ گرانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسی ساری تقریروں کو دل میں دہرائیے کہ جن میں کہا گیا ہے کہ انکی ساری یاترائیں چاہے وہ رتھ پر ہوں یا گھوڑوں پر، ٹینکوں پر ہوں یا بکتر بند گاڑیوں پر انکے پیدائشی دوغلے اور کمینے پن کا اعلان ہیں۔

اب یہ بھی جان لو، جو شائد تم پہلے نہیں جانتے تھے اور خدا جانے اس وقت بھی جاننا چاہتے ہو کہ نہیں کہ آم کو خود پر کوئی گمان نہیں ہوتا۔ وہ جھوٹ بولتا اور نہ فریب کرتا ہے اور نہ مینو پولیشن کرتا ہے اور نہ جوڑ توڑ، یہ اختیارات تو تم جیسے انسانوں کو ہیں اس نے تو بس آم ہونا ہی قبول کیا ہے اور اس نے اپنے ہونے میں ایک سیدھا پن یہ کیا ہے ممّو خاں صاحب کہ وہ اپنی حیثیت کو نہیں بھولتا، وہ کٹھل بننے کا خواب نہیں دیکھتا۔ اچھا! کیا آپ اپنے والد کے زمانے کے ایک باغبان کو بھول گئے، جو اپنا سب کچھ بیچ باچ کر شہر چلے گئے تھے، وہاں آئس کریم کا ایک کارخانہ ڈالا منافع کمایا پھر ایک سینما ہال چلایا، خوب کمایا، وہ کٹھل ہو گئے، خوب بھاری بھرکم، خوب گودا تھا اُن میں، پکے پکے سے، یہاں تک کہ سڑنے لگے، مگر بیٹا ممو خاں وہ آم نہ رہے، کچھ نیا بننے کے لئے پرانا چھوڑنا پڑتا ہے، انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب وہ آم تھے تو بھی توپ نہیں تھے اور جب وہ بڑی مشکل سے کٹھل بنے تو آم نہیں رہ گئے، جب توپ بن جائیں گے تو کٹھل نہیں رہیں گے۔

آخر یہ بات تم کئی دنوں سے کیوں سوچ رہے ہو کہ کیا ضروری ہے کہ پرتاپ شکلا نے ہی شوکت جہاں کو قتل کرایا ہوگا۔ شوکت، ایروبک، بھی تو لڑکیوں کو کرواتی تھی، سونے کی زنجیر پہن کر موٹر سائکل پر دھواں اڑاتا ایک اوباش باپ کا اوباش لونڈا اپنی بہن کو وہاں لیکر آتا تھا آج کی فلموں میں ایسے لونڈوں کو خوبصورت لڑکیوں کو ریپ کرنے کا جو جنون دکھایا جاتا ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس موٹر سائیکل والے نے، چمڑے کے آدھے دستانے اور الٹی پی کیپ پہننے والے نے ڈرگ کا استعمال کرنے والے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ کیا ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ لاش کو کہاں پھینکا جائے

جو پولیس بھٹک جائے، بہت ممکن ہے یہ لونڈا اور اسکے ساتھی بہت پہلے سے شوکت کی آوا جاوی پر نظر رکھتے رہے ہوں۔

کل اگر پولیس نے ایسا ہی ثابت کر دیا۔ ؟اور وہ بالکل صحیح بھی ہوا تو؟

بتاؤ ممو خاں۔۔ تو؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ پرتاپ شکلا بس ندیدا ہی رہا ہو، رال بہاتا ہو، اندھیرے اجالے چوما چاٹی کر کے آگے کے لئے شوکت کو راستے پر لگا کر دیکھنے کی بس ہمت جٹا رہا ہو۔ تفتیش کے دوران پولیس سے لیکر کئی دوسرے لوگوں کے دلوں میں پرتاپ شکلا اور شہباز پر شک تھا۔ بعد میں اگر یہ مشہور ہوا کہ سیاسی دباؤ میں آکر پولیس نے پرتاپ شکلا کی طرف سے اپنا رویہ بدلکر اس راستے پر چلنا شروع کر دیا کہ ہو نہ ہو یہ کام شہباز خاں کے تجارتی دشمنوں کا ہے تو اسمیں تعجب کیکونسی بات ہے۔

لیکن ممو خاں، اس سناٹے میں تم اپنی تہمد باندھے اپنے حقّے سے شغل کر رہے ہو اور راٹھور گیارھویں بساط پھاڑ کر مہرے بکھرا کر اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر پاپڑ بیلنے جا چکا ہے۔ تو تمہارے پاس یہ سوچنے کے لئے کافی وقت ہے کہ آخر تم نے پرتاپ شکلا کو اس کمینے پن کے ساتھ کیوں مروا دیا۔ ؟

کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ پرتاپ نے ہی شوکت جہاں کی عزت لی۔۔ نہیں!

کیا اس نے تمہارے باغوں کو کوئی نقصان پہنچایا تھا؟۔۔۔ نہیں!!

کیا پرتاپ تمہاری ذاتی زندگی کے لئے کوئی خطرہ تھا؟۔۔ نہیں!!!

کیا پرتاپ نے تمھیں کبھی للکارا کہ سالے ذرا باہر تو نکل؟۔ نہیں

تو پھر سالے، لچّے لفنگے ممو خاں، ابے او حرامی کی اولاد۔ تو نے پرتاپ کو کیوں مارا؟

سوچ۔۔

حقہ پیتا جا اور سوچتا جا۔

لیکن ایسا بھی نہیں ممو خاں کہ تو نے بالکل سوچا ہی نہیں ہو۔۔

تم تو بیٹا جب پرتاپ شکلا کو مارنے والا کھاتا کھول رہے تھے تب ہی تم نے سوچا ہوگا، یہ قتل تو تم نے برف جیسے ٹھنڈے خون کے ساتھ کیا ہے ایک ایک قدم سوچ کر اٹھایا ہے جسے قتل نہیں مونڈن کرنے جا رہے ہو۔ تم گدّی میں عقل رکھنے والے جنگلی زمانے کے جلالی پٹھانوں کی نسل سے ضرور ہو لیکن نئے زمانے نے تمھیں اب خاصہ ہوشیار کر دیا ہے۔ نفع نقصان دیکھ کر کام کرتے ہو۔ کبھی تم نے کسی سے مار پیٹ بھی نہیں کی، تو یہ بات تو گلے سے نہیں اترے گی کہ تم نے اپنی خاندانی پٹھانی کے

اُبال میں یہ قدم اٹھایا ہے۔۔ تو بتاؤ پٹھان میاں کیا بات تھی ؟ اگر دنیا کو معلوم ہو جائے کہ یہ قتل تم نے کرایا ہے تو اسے کچھ تعجب تو ہو گا ہی کہ یہ کام تو اس زنخے قدرت اللہ کو کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ گھر میں گھس کر بھی پرتاپ شکلا کو مار ڈالتا تو عدالت کو بھی زیادہ حیرت نہ ہوتی کہ شوکت اسکی بہن تھی۔ لیکن تم نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا؟

کیا تم کوئی الیکشن لڑ رہے تھے جسے جیت نے کے لئے یہ قتل ضروری تھا۔ ؟۔ نہیں!

کیا تمھیں موٹی رقم والا کوئی ٹھیکہ ملنے والا تھا جو اس قتل کے بغیر ملنا ممکن نہیں تھا؟۔ نہیں

کیا تمہیں بدنام خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے یہ کام نپٹانے کے لئے لالچ دی تھی ؟۔۔ لاحول

تو پھر جو قتل قدرت اللہ نے نہیں کیا وہ تم نے کیوں کر دیا؟ بولو ؟

استاد! اس مشکل سوال کا جواب تم یہ دیتے ہو کہ شہر کی میونسپلٹی صبح صبح شہر کا کچرا تو ٹرالیوں میں سمیٹ لے جاتی ہے لیکن شہر کے ہاتھوں دن رات کا بکھرایا ہوا خوف و حراس سڑکوں پر ہی پڑا رہ جاتا ہے اور پچھلے پچاس برسوں سے پھیکا ہوا یہ اجتماعی ملبہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور اسے دفن کرنے کا کوئی انتظام نہ ہونے پر یہ آخر عمارتوں سے بھی اونچا ہو چکا ہے۔

لیکن تم ہی اپنی اس تقریر کے جواب میں خود اپنے آپ سے یہ سوال بھی تو کرتے ہو کہ قدرت بھی تو اسی کے درمیان رہ رہا ہے پھر اس خوف یا خوف کے دباؤ میں اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے تم دن بھر حقہ پیتے ہو، پھر ٹہلتے ہو، پھر بوڑھے ملازم کو گالیاں دیتے ہو پھر پیخانے چلے جاتے ہو پھر نہاتے ہو پھر سوچتے ہو کہ اب پنج وقتہ نمازیں شروع کر دینی چاہئے لیکن شروع نہیں کرتے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہو

خوف کوئی مینا کشی دکشت تو ہے نہیں جسکی ایک ہی شکل ہو، خوف کی ہزار شکلیں ہیں اور ہر شکل کے الگ الگ ردّ عمل ہیں۔

پھر کہتے ہو۔۔

قدرت اللہ وہ سیدھا سادا مسلمان ہے جو دین کی تین چوتھائی باتیں تو مانتا ہے اور ان پر عمل بھی بہت

کچھ کرتا ہے لیکن وہی قدرت اللہ ضرورت پڑنے پر دین پر جان دینے کے لئے سو بار سوچے گا جبکہ ایسے مسلمان جو روزانہ کی زندگی میں دین کی ایک بات بھی کبھی نہیں مانتے اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ انکو نماز ہی یاد رہ گئی ہے گرم حالات میں اپنے کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے دین پر جان بھی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ خوف تو ایک ہی ہے مگر ان جانبازوں پر اسکا اثر کچھ ہے اور سہمے دبکے قدرت اللہ پر اسکا اثر کچھ اور۔

تب میاں موخاں تم یہ کہکر نکل لیتے ہو کہ قدرت تو غریب اپنی ٹوٹی پھوٹی گرہستی کے ڈر سے ہی دُبکا رہتا ہے، وہ تو پہلے ہی سے سہا ہوا خدا کی راہ میں لڑی جانے والی خاموش بے ضرر اور پاک لڑائی میں گرفتار ہے جہاں اپنے آس پاس کے سارے ڈروں کو کسی بھی طرح نظر انداز کرتے رہنے کا ناٹک کھیل کر اُسے پھسلائے رہنے کا چانس لیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جب تم ایک بار شکار پر گئے تھے یہ جانتے ہوئے کہ وہاں شیر ہو سکتا ہے تم اپنی احتیاط بھر قدم بھی اٹھا رہے تھے کہ یکایک تمہارے سامنے شیر آگیا تھا، اتنا پاس کہ تمکو بندوق اٹھانے کا بھی یارا نہ تھا، تو تم دَم سادھ کر بلا حرکت، پتھر کی مورت کی طرح، جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔۔ تب خوف کی بجلی نے تمہارے جسم کا خون جیسے جلا کر رکھ دیا تھا اب یہ شیر کے اس وقت کے مزاج پر منحصر تھا کہ وہ تم پر ایک اوچھی سی نظر ڈالکر اپنا راستہ لے یا غرا کر تم پر چھلانگ لگادے کہ تم دونوں ہی طرح سے راضی تھے۔

قدرت دفتر سے روٹھتا تو بے بسی میں گھر چلا آتا۔

منا کر لایا جاتا تو بے بسی میں دفتر چلا آتا۔

یہ کس نے دیکھا تھا کہ اس پر خوف کی گرنے والی بجلی نے اسکا خون جلا دیا تھا، کسی کا خون جل جاتا ہے تو کسی کا خون کھولنے لگتا ہے۔

ان خوفزدہ یہودیوں کا اگر پوسٹ مارٹم ہو سکتا جنھیں جہاز میں بٹھا کر ہٹلر بیچ سمندر میں جنگی پن ڈبیوں کے ذریعہ جہاز کے تلے میں چپکے سے چھید کروا کر جہاز کو غرق کروا دیتا تھا تو اُن سب کا خون جلا ہوا ہی ملتا۔ اسی لئے تو تم بہت اٹھلا اٹھلا کر اس دن راٹھور سے شطرنج کھیلتے میں کہہ رہے تھے کہ آنجہانی حضرت بوناپارٹ کے دستِ مبارک میں اپنے خوف کو کندھوں سے جھٹکنے کے لئے ہزاروں جانوں کو تلف کرنے کے وسائل موجود تھے سو انھوں نے وہسا ہی کیا۔

یار خاں صاحب! تم نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ جب شہباز سالا کام کی آئے دن دعوتیں

کرتا ہے، انکم ٹیکر والوں اور جانے کیسے کیسے پھٹیچر افسروں کو ولائتی شرابوں سے نہلاتا ہے، جماعت اسلامی اور ہندو و شوپریشد کو ایک ساتھ بالٹیاں بھر بھر کر چندے کی شکل میں نوٹ پہنچاتا ہے اور فسادات کے زمانے میں سرمایہ کاروں کے ساتھ آپسی بات چیت کر کے اپنے اور اپنے کاروبار کے فائدوں کی حفاظت کے لئے ہندوؤں کے محلے میں انکے دفاع کی خاطر ہندوؤں کو چوری چھپے بندوقیں وغیرہ سپلائی کرانے کے لئے اپنی گاڑی استعمال کرواتا ہے، جو پکڑے جانے پر چپ چاپ چھڑالی جاتی ہے تو اس وقت بھی یہ کون جان پاتا ہے کہ اتنی دولت لگا کر اور اتنا جوکھم اٹھا کر شہباز بیچارہ بس اسی خوف کو اپنے کندھوں سے اتار کر کم کرنے کے جتن میں ہی لگا ہے۔

اس لئے خاں صاحب چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں کہ آپ کا بھی ایک کندھا کافی عرصے سے بہت جھکا ہوا لگنے لگا تھا اور اس میں ہر دم ایک انجانا سا درد رہنے لگا تھا۔ اب آپ کو اپنے گھر کے اطراف میں کچھ اجنبی لوگ جیپ پر سوار کبھی کبھی گھومتے اور آپ کو عجیب نگاہوں سے گھورتے نظر آتے رہتے ہیں۔ اس لئے ممو خاں تمھیں اپنے مرے باپ کی قسم، کہو اور زور سے کہو
میں نے پرتاپ شکلا کو نہیں ایک خوف کو قتل کیا ہے۔ (شاباش)

تو پھر یہ بھی سمجھا دو ممو خاں کہ تم تو آموں کے سُبھاؤ کو لیکر بہت ڈینگیں مارا کرتے تھے، کہتے تھے تم نے خود کو برتنے کے لئے آموں سے سبق لئے ہیں، کہاں گیا تمہارا وہ مینگوازم۔ لیکن تم نے اس روز دو دو ڈونگے تازی رسا ول اپنے پیٹ کے گودام میں بھر کر اس الجھن کو بھی سلجھانے کا راستہ نکال لیا تھا۔

تم بیٹا پھولے نہیں سما رہے تھے اپنی فتینی پر۔ کیا زور زور سے کہہ رہے تھے کہ جن آموں کے باغوں کے چاروں طرف کچی اینٹیں پکانے کے بھٹے کثرت سے ہوتے ہیں ان آموں کا آم پن مر جاتا ہے یہاں تک کہ پیڑ بھی دھوئیں سے اپنی شادابی کھو دیتے ہیں۔ تم نے چہک کر یہ بھی کہا تھا۔ متھرا ریفائنری کو تاج محل کے پاس سے ہٹانے کا شور تو بہت اٹھتا ہے لیکن آدمی کے دل کے تاج محل کا کسی کو ہوش نہیں۔

کوئی مشکل سے شائد مانے لیکن تمہاری اس بات میں کچھ دم تو ہے کہ اگر تم پرتاپ شکلا کو نہیں بھی مارتے تو اسکی کیا ضمانت تھی کہ اسے کوئی دوسرا نہیں مارے گا کیونکہ اب دن بہ دن اپنی

موت مرنے کا چلن گھٹتا جا رہا ہے، کوئی مارتا ہے تب ہی کوئی مرتا ہے۔ اور تم جو جرم کر کے قانون سے خود کو چھپالے گئے ہو تو اسکی کیا ضمانت ہے کہ کسی دن اپنے ہی باغ میں اپنے ہی کسی خوفزدہ ملی بگ کے ہاتھوں تم خاک اور خون میں تڑپتے نظر نہیں آؤ گے۔

اپنے آموں کو زرا غور سے دیکھو۔

اگر یہ تمکو آم جیسے، اوپر سے گول اور نیچے سے آموں کی طرح ہی خم کھائے ہوئے نظر آئیں، انکی رنگت بھی سبز اور زردی مائل ہو لیکن ان آموں کے پورے جسم پر، یعنی انکی اوپری کھال پر کٹھل کی طرح خاردار دانے سے دکھائی دیں تو تم پر کیا گزرے گی؟ تم بھاگے بھاگے پھرو گے۔

میامار فاسس ہو رہا ہے،

پھر جیسی روح ہو گی ویسا ذائقہ ہو گا۔

لیکن بھائی میاں! تمہارا حقہ بھی اب ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ تمہارے باغ کے گیدڑوں کی بھی اب آنکھ لگ گئی ہے۔ پھر تم یہ کروٹیں کیوں بدل رہے ہو!؟ رام کھلاون کھٹیک نے جب تمہارے پڑوس کا باغ خریدا، اسکے چاروں طرف اینٹوں کی دیوار اٹھوائی، شاندار پھاٹک بنوایا اور اس پر کیسریا جھنڈا بھی چھوٹا سا لہرایا اور سب کو مٹھائی تقسیم کی تو اس روز بھی اپنے غسل خانے میں تم چلا چلا کر کہے جا رہے تھے اور نہاتے جا رہے تھے۔۔

"میں وہی مموخاں ہوں۔"

اس روز جب مشاعرے میں تم موٹا چندہ دیکر سب سے آگے بٹھائے گئے تھے تو تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اور بار بار تمہاری ہی طرف دیکھ کر، اور اشاروں سے تمکو ہی مخاطب کر کے ایک شاعر تمھیں کو اپنی نظم کیوں سنا رہا تھا

یہ خنجر لو، اور وار کرو۔۔ [1]

اور میرے سو ٹکڑے کر دو۔۔

تم ایک باغ بان وہ بھی آم جیسا میٹھا پھل پیدا کرنے والا باغ بان، خنجر اور سو ٹکڑے، سے تمھیں کیا لینا دینا۔۔

---

[1] شہریار

مگر وہ پھر بھی تمہاری ہی طرف انگلی اٹھا کر کیوں کہہ رہا تھا۔۔ ؟

یہ خنجر لو اور وار کرو

اور میرے سو ٹکڑے کر دو

پھر چھلنی جسم کو سہلاؤ

آنکھوں کی اوس میں نہلاؤ

تم میرے قاتل کہلاؤ

اُس دن کے لئے میں زندہ ہوں

"اس دن۔۔ "کون اُس دن ؟

آخر کو مموخاں کروٹیں بدلکر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اتوار کی صبح تھی، باہر ناشتے سے فارغ ہو کر راٹھور شطرنج کی بازی جمانے کے لئے، نئی بساط پکڑے دروازہ پیٹ رہا تھا۔

قدرت اللہ کو نئے دفتر میں بیٹھے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن فجر کی نماز ادا کر کے جب وہ مسجد سے باہر نکلا تو پٹیل کے چائے خانے کی بھٹی سرخ ہو چکی تھی اور سماور کی چائے تیار تھی۔ قدرت کے ساتھ مسجد سے باہر آنے والوں میں کچھ لوگ دینی ماہنامہ "الرسالہ" کے مستقل خریدار تھے، جب اُن میں سے دو تین نمازی قدرت کے ساتھ پٹیل کے چائے خانے میں صبح صبح کی گرم چائے پینے کے لئے بیٹھے تو ایک نے الرسالہ" کے کسی مضمون کا ذکر چھیڑ دیا۔

قدرت دیر تک اس بحث میں الجھا رہا کہ حقیقت دراصل یہ ہے کہ عام مسلمان یہ نہیں جانتا کہ اسے چاہئے کیا ہے۔ اس بات پر بحث بڑھ گئی۔ آخر ایک داڑھی والے نمازی نے درمیان کا راستہ نکالا اور بولا۔

"عام ہندو کو بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ مسلمان سے چاہتا کیا ہے۔"

"تو سبب کیا ہے اس کا؟"

"ویسے تو کئی اسباب ہیں۔ لیکن جس مضمون پر بحث ہو رہی ہے اس کی رو سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ ملک کے عام ہندو نے ملک کی بدقسمت تقسیم کو ایک تاریخی المیہ نہ مان کر اسے براہ راست مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز شکست مان لیا ہے اور شکست کی پسپائی کا یہ احساس اس کو

مسلمانوں کا دوست بننے میں لگاتار رکاوٹ بن رہا ہے۔ گویا ہندو اور مسلمان دو قومیں تھیں دونوں اپنے اپنے قومی وقار کو لے کر آزادی کی لڑائی لڑ رہی تھیں۔ مسلمان نے ملک تقسیم کر کے اپنے لئے ایک ملک علٰحدہ بنالیا اور اس طرح ہندو کو پہلی شکست دے کر اس کے قومی وقار کو صدمہ پہونچایا۔"

اب پھر وہی مسلمان آئے دن عام ہندو کے لئے ایک درد سر بنتا جا رہا ہے۔ تو کیا ہندو اس مسلمان سے جس سے وہ ایک بار شکست کھا چکا ہے دوسری بار پھر ہار جائے اور دوسری شکست کی شرمندگی قبول کرلے۔؟

نہیں ہرگز نہیں۔۔۔

"یہ اب نہیں ہوگا!

اب ہندو نہیں ہارے گا!

مولانا وحید الدین خاں صاحب کے مضمون پر لمبی چوڑی بات چیت کے بعد قدرت اللہ دفتر آیا تو اس نے مضمون کا ایک اقتباس چھاپنے کو دے دیا۔ جو اس طرح تھا۔

"ہندو اگر بٹوارے کو فرسٹ ڈفیٹ (FIRST DEFEAT) کے طور پر نہ لیتے بلکہ گزرے ہوئے دور کا ایک واقعہ سمجھ کر اس کو ماضی کی تاریخ کے خانے میں ڈال دیتے تو ۱۹۴۷ سے اسی طرح ملک کی نئی تاریخ شروع ہو جاتی جس طرح عین اسی زمانے میں جاپان میں نئی تاریخ بننا شروع ہوئی تھی مگر فرسٹ ڈفیٹ اور سکنڈ ڈفیٹ کے فلسفے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امکان واقعہ کی صورت نہ اختیار کر سکا۔"(۱)

جب اخبار چھپ کر آیا تو وہ مضمون اس میں نہیں تھا۔ اس کی جگہ کسی دوسرے کے مضمون کا یہ اقتباس چھپا تھا۔

"جو لوگ پاکستان کے سب سے کم خواہشمند تھے، انھیں پاکستان ملا۔ اور جو پاکستان کے سب سے زیادہ طالب تھے وہ ہندوستان میں رہ گئے۔ علیحدگی پسند مسلمانوں نے جلد ہی خود کو سیکولر کانگریس سے جوڑ لیا اور بعد ازاں یہاں کے مسلم قومی لیڈروں نے مقیم حال مسلم فرقہ پرستوں کے پھلنے پھولنے کے لئے راہ ہموار کی۔ اس کے سبب انھیں اپنے لئے مسلم برادری کا ووٹ بینک قائم کرنے کا خوب موقع مل گیا۔ اور اس طرح ہندوستانی قوم کے اندر ہی ایک اور علیحدہ قوم کی تعمیر میں انھیں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہم تلخیوں اور کرواہٹوں کی فصل کاٹ رہے

---

(۱) ہندوستانی مسلمان، مولانا وحید الدین خاں۔

ہیں۔"(۲)

قدرت کو گھر پر بے کار بیٹھے دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ اس بار اس کو دفتر سے کوئی بلانے نہیں آیا تھا۔ ایک رات بیوی نے اسے آگاہ کیا۔

"آمدنی بڑھاؤ تمہاری بیٹی کا ایک خرچ اور بڑھ رہا ہے کیونکہ آج سے وہ بڑی ہو گئی ہے۔"

قدرت کی بیٹی کمّو چارپائی پر ویسے ہی بے خبر سو رہی تھی جیسے شوکت پسینے میں نہائی بے سُدھ سویا کرتی تھی۔ قدرت نے کمّو کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیار سے پہلی بار سمیٹا۔ اسے یاد آیا کہ ممّوں خاں نے اُسے بتایا تھا کی فصل تیاری پر ہے، کسی دِن اُن سے مل لے، یومیہ عوضی پر کام مل جائے گا، اسی وقت قدرت کی نگاہ بیٹی کے داہنے پیر پر پڑی، انگوٹھے کے پاس ایک تازہ آبلہ موتی کی طرح چمک رہا تھا، بیوی نے بتایا کہ نئی ہوائی چپّل کے سخت تسمے نے کاٹا ہے۔ آبلے میں سارے دن بڑی تپکن رہی ہے۔ قدرت نے دھیرے سے آبلے کو چھوا تو اسے خُود کے اندر بھی کہیں ایک آبلہ تپکتا ہوا محسوس ہوا۔ اُسے خیال آیا شہباز نے اس سے کہا تھا کہ وہ اردو کا ایک اخبار نکالنے کا ارادہ کر رہا ہے، کسی دن قدرت کو ضرور بُلائے گا۔ قدرت نے ایک موہوم سی افسردگی کے ساتھ بیوی سے ایک سوئی مانگی اور ماچس جلا کر سوئی کی نوک کو گرم کیا، بیوی نے اُسے ٹوکا کہ کسی دن آبلہ خود ہی پھُوٹ جائے گا تو قدرت ایک پل کمّو کے آبلے کو پہلے تو تکتا رہا پھر جھنجھلا کر بولا۔

"کیا ہر بات کے لئے کسی دن کا انتظار ضروری ہے"

اور سوئی کی جلتی ہوئی گرم نوک آبلے میں چبھو دی۔

(۱۱)

وقت بھی خوب ہے، کیسے کیسے چھالے ڈالتا ہے پھر انھیں تپکاتا ہے۔ وہ تپکن بار بار تڑپاتی ہے لیکن پھر خود ہی کسی دن وقت اُن میں سوئی چُبھو دیتا ہے۔ کمّو جوان ہوئی تو کسی نجومی نے بتایا کہ وہ سات سمندر پار جائے گی۔ کچّی انگنائی میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے جھاڑو لگانے والی لڑکی واقعی

(۱) A Hindu View about Indian Muslims از موہن گوسوامی۔ مطبوعہ ہندوستان ٹائمس باب ۱۵ جون ۱۹۹۶ ترجمہ: اقبال مجید

ایک دن سمندر پار کر کے لندن کے کہرے میں ڈوبی ہوئی روشنیوں کے جگنوؤں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور اسکا باپ قدرت اللہ سہما ہوا یہ یقین نہیں کر رہا تھا کہ وہ سب خواب تھا یا حقیقت۔

کمّو اب لندن میں چار سال گزار کر ہندوستان واپس آچکی ہے کہ وقت پر لگا کر اڑتا ہے۔ اب اسے ماں کے ہاتھ کی پکائی جوار کی روٹی اکثر یاد آتی ہے۔ وہ گہری سوچ میں کسی سے دریافت کرتی ہے۔

کیا آپ نے جوار کی تازہ روٹی دیکھی ہے۔؟

چولھے کے انگاروں پر مدھم آنچ میں سینکی ہوئی گرم، سرخ اور سوندھی جوار کی روٹی! یہ روٹی پھونک پھونک کر اور لقمے نوچ نوچ کر کھائی جاتی ہے۔ اگر آپ نے یہ روٹی نہیں دیکھی ہے تو آیئے میں آپ کو دکھادوں۔ یعنی آپ کو اپنے پچھلے آنسوؤں سے متعارف کرادوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو تکا بوٹی کر کے الگ الگ ٹکڑوں میں پہچاننے کی کوشش میں سموچی حقیقت ہاتھ نہیں آتی

آپ مجھ ہی کو دیکھ لیں۔

ویسے آپ مجھ ہی کو فی الحال دیکھنے کے لئے مجبور بھی ہیں۔

ویسے بھی لوگ دیکھتے بھی ٹکڑوں میں اور محسوس بھی ٹکڑوں میں ہی کرتے ہیں۔

چاروں طرف موم بتیاں اور درمیان میں ایک بہت پُرکشش بہت رنگین اور خوب رو اور ذائقہ دار کیک۔ یہ کیک اب میں ہوں۔ یعنی جوار کی گرم سرخ اور سوندھی روٹی اب خوشنما کیک بن گئی ہے۔ پڑھے لکھوں کا کہنا ہے کہ ''ہمارے پچھلے قہقہے اور پچھلے آنسوؤں کا حال کے قہقہوں اور حال کے آنسوؤں سے کوئی ربط نہیں ہوتا،

جب میرے باپ نے مجھے روزہ نماز سکھائی تو مجھے اپنی شائستہ کرداری کے لئے سونے سے پیشتر حضرت امام زین العابدین کی یہ دعا پڑھنا بھی سکھائی گئی۔

''بار الہا! میرے نفس کو بندگی اور عبادت کے لئے رام کر۔ اور خود پسندی سے میری عبادت کو فاسد نہ ہونے دے۔ بار الہا۔ عدل کے نشر، غصّے کے ضبط اور فتنے کے فرو کرنے اور پراگندہ لوگوں کو ملانے، نیکی کے ظاہر کرنے، عیب پر پردہ ڈالنے، فضیلت کی طرف پیش قدمی کرنے، تفضّل واحسان کو ترجیح دینے کی توفیق عطا کر۔ اے اللہ بلا کے نازل ہونے سے پہلے عافیت، مانگنے سے پہلے خوشحالی اور گمراہی سے پہلے ہدائت سے مجھ پر احسان فرما۔!''

میں ایک لڑکی۔

انگاروں پر دھیمے دھیمے سینکی ہوئی گرم سرخ اور سوندھی سی لڑکی مجھے پھونک پھونک کر اور نوچ نوچ کر کھالیا گیا اور میں عدل، قرار، عافیت اور ہدائت کی دعا ہی مانگتی رہ گئی۔ پتہ نہیں آپ کو میرے بارے میں کتنا معلوم ہے۔ پڑھے لکھوں کو اگرچہ یہ یقین ہے کہ تاریخ میں کہیں نہ کہیں ہلکی سی حرکت ضرور ہے جسکے ذریعے ہم آپ اپنے جیسے انسانوں کے بارے میں مسلسل شعور حاصل کر رہے ہیں۔

یہ جو آج میرے پاس لفظ ہیں پہلے نہ تھے۔ سوچتی ہوں جتنا کچھ میری پکڑ میں آیا ہے اسے آپ کے حوالے کردوں۔ پھر سوچتی ہوں کیا کچھ منکشف بھی ہوا ہے؟ آگہی کے بیکراں سمندر میں مجھ جیسی بے بساط عورت کو دھکا دے کر تجربوں کے بے رحم ریلوں میں پھنسا کر کیا وقت نے میری فہم اور میرے ادراک کو کچھ عطا بھی کیا ہے جو قابل ذکر ہو۔

جی ہاں۔ میں یہ قدرت اللہ کی بیٹی کمّو ہوں۔ دراصل یہ بات مجھے انکساری کی وجہ سے کہنا پڑ رہی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اب تک جو کچھ دیکھ چکی ہوں، سہہ چکی ہوں اسکی مناسبت دے یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا کہ قدرت اللہ میرا باپ نہیں بلکہ میں قدرت اللہ کی باپ ہوں۔

بڑا ناز تھا مجھے اپنی افضلیت پر کہ میں اپنے باپ سے زیادہ جانتی ہوں۔ مگر آج جب ہاتھ مل مل کر اپنی کم مائیگی کا تاسف بھی نہیں کرپار ہی تو سارے بھرم ٹوٹ چکے ہیں۔

جب میں نے پہلی بار لندن سے واپسی پر اپنے وطن میں قدم رکھا تو میرے پاس پیسہ تھا ایک کلاس سے نکل کر دوسرے کلاس میں گھس پل جانے کے ولولے تھے میرے وطن والے Neo-Rich کہہ کر خدا جانے میرا مذاق اڑاتے تھے یا میری توصیف کرتے۔ تھے اسکا مجھے ٹھیک اندازہ نہیں کیونکہ جب اتنا کچھ ہو جائے تو اپنی کھال میں مگن رہنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

لیکن وہ مرد۔ کئی لوگوں کے بیچ بیٹھا ہوا وہ مرد جب اپنی کرسی سے اٹھکی میری کرسی کے پاس آیا تھا تو اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"کمّو جی۔ اپنی کھال میں مگن رہئیے مگر پیر ہمیشہ زمین پر ہی رکھئے گا۔"

چاہتی ہوں کہ اُس مرد کے ذکر کے بغیر ساری باتیں کر ڈالوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟۔ وہ اتنے لوگوں کے بیچ میں کرسیوں سے گذرتا ہوا مجھے شاید صرف یہ بتانے نہیں آیا تھا کہ مجھے اپنے پیر زمین پر رکھنا چاہئیے۔

پورے شہر میں یہ خبر پھیل چکی تھی کمّو واپس آگئی ہے اب لندن نہیں جائے گی۔ انہیں

دنوں لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد کی خبر آئی تو ایک بار پھر مجھے اپنا ناراض باپ بہت یاد آیا۔ اسے ان خبروں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ مجھے یاد ہے یہ خبر پڑھ کر میرے باپ نے ایک بار مجھے حضرت محمد بن ادریس شافعی کا ایک حوالہ پڑھ کر سنایا تھا۔

"اے جانے والے ناقے پر سوار! ذرا سرزمین مکہ پر منیٰ کے قریب ٹھہر اور جو جو ادھر اُدھر لوگ ہیں پکار کر کہہ دے اس وقت جب صاحبان کعبہ منیٰ کی سرزمین پر جمع ہوتے ہیں۔ کہہ دے کہ اگر آل رسول کی دوستی کا نام رافضی ہوتا ہے تو دونوں جہان گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔"

وہ دن کتنے اچھے تھے۔ کاش میں اپنی کھال میں مگن رہ سکتی۔ میری سوتیلی پھوپھی شوکت جہاں قتل ہوئی۔ میرا باپ قدرت اللہ بے روزگاری میں ٹھوکریں کھاتا رہا اور میں ایک فیور پٹھان کی پوتی سرزمین ہند سے لندن شادی کے بہانے اس لئے امپورٹ کی گئی کہ اپنے شوہر کی نشیلی دواؤں کی غیر قانونی تجارت کے تصرف میں آسکوں۔ ہم نے بس ایک ہی پیمانِ وفا باندھا تھا۔

ایک منڈی سے دوسری منڈی کنزیومر پیدا کرو۔

لندن کی گیلی اور خشک راتوں میں جب میرا جوان خوب رو مگر رعونت کا پتلا مضبوط جسم والا شوہر عیاش عورتوں کی رانوں میں منہ ڈالے پڑا ہوتا تو میں کچی عمر کے لونڈے لونڈیوں کو نشیلے خوابوں میں پرواز کرنا سکھاتی اور جب اپنے کمرے میں واپس آتی تو ایوننگ نیوز کو میرا انتظار رہتا۔ وہاں کے بعض تونگر ہمارے گھر پر جمع ہوتے انھیں ہندوستان کے مسلمانوں کا حال چال جاننے کی اکثر فکر رہا کرتی۔ ایک دن ایک اخبار میں ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کچھ اسطرح کی خبر پڑھی گئی۔

مسلم قائد صرف بے معنی مسائل کو اٹھا کر پریشان رہتے ہیں۔ انکا اصل مقصد سماجی اصلاح کے لئے سنجیدہ کوشش کرنا نہیں بلکہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

ہمارا گھر شاعروں ادیبوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں کے منصوبے بنا کرتے، نیم سیاسی اور سماجی بحثیں ہوا کرتیں ممکن ہے کہ میرا شوہر یہ سب، فیشن کے طور پر کرتا ہو مگر میرا خیال تھا کہ دنیا سے اگر خبر نکال دی جائے تو دنیا کافی امن چین کی جگہ بن سکتی ہے۔ میں خبروں سے گھبراتی تھی مجھے ایک انجانی چپ سی لگ جاتی تھی۔ جب نیویارک پولیس نے اپنی چند دنوں کی مقامی گشت میں ایسے نوجوانوں کی ۳۸ لاشیں تلاش کیں جنکی عمر ۱۶ سے ۳۵ سال کے درمیان تھی۔ اور جنکی موت کا سبب نشہ آور چیزوں کا استعمال تھا اور انہیں بعض مرنے والے نوجوان ایسے بھی تھے کہ مرنے سے پہلے اپنے بازوؤں سے سیرنج بھی نہ نکال پائے تھے تو سارے دن مجھے

ابکائیاں سی آتی رہی تھیں۔

خبروں کے بعد پھر رات آتی ہے، میں سونے کی تیاری کرتی ہوں، بالوں میں جالی باندھتی ہوں، آئینے کے سامنے اپناوزنی اور چیچپاتا ہوا میک اپ اتارتی ہوں، چہرے کا کریم ایک خاص لوشن سے پچھڑواتی ہوں، حنوط کی ہوئی ممی کی طرح آئینہ میں ایک بدرونق چہرہ نظر آتا ہے۔ پھر میں چار کھدر کے سفید دستانے اٹھاتی ہوں دونوں ہاتھوں اور پیروں میں پہنتی ہوں کہ میرے بڑھے ہوئے ناخن کمبل یا لحاف سے اُلجھ کر ٹوٹ نہ جائیں۔ پھر میں نیند کی گولیاں کھاتی ہوں۔ اور غنودگی میں ڈوبنے لگتی ہوں۔ آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کی آمد و رفت میں اہل عقل کے لئے نشانیاں مضمر ہیں۔

نشانیاں مضمر ہیں۔

اور پھر ایک مقدس ورق کانوں میں پھڑ پھڑانے لگتا۔

اے رسول! کیوں نہیں،۔۔ کیوں نہیں یہ لوگ زمین میں سیر و سیاحت کرتے اور دیکھتے کہ کیا انجام ہوا اُن لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ اے رسول جو ان سے پہلے تھے وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے رہے اور اُنھوں نے زمین پر ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اور عمارتیں قائم کی تھیں اُس سے زیادہ کہ جتنی اُنھوں عمارتیں بنائی ہیں۔"

اہل عقل کے لئے نشانیاں مضمر ہیں۔

ایک چھٹی کی صبح جب میں اٹھی تو ڈرائنگ روم میں ہنگامہ برپا تھا۔ ہندوستان سے محشر خیالی مامو آئے تھے وہ کناڈا سے مشاعرہ پڑھکر نکلے تھے بغل میں مشاعروں میں دغنے والی ایک لمبا منگیشکر بھی دبائے تھے وہ خوش تھے کہ مشاعروں کی کنزیومر خوب پیدا ہو رہے ہیں۔ زبان کے بارے میں انکا خیال تھا کہ مشاعروں کا اگر یہی حال رہا تو اُردو بہت جلد بین الاقوامی رابطے کی زبان بن جائے گی (خدا جانے ما کب مذاق کرتے تھے اور کب سنجیدہ ہو جاتے تھے)

ہندوستان میں میری دلچسپی کا ایک ہی موضوع تھا۔ یعنی وہاں کے مسلمانوں کی حالت۔ محشر ما سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر سب ایک دوسرے سے باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے اور میں کچن میں کافی بنانے کے لئے پہنچ چکی تھی۔ باتوں کی آوازوں سے مجھے یہ لگا کہ وہ لوگ خدا جانے کسطرح امریکہ میں کتوں کے قبرستانوں کا موضوع چھیڑ چکے تھے۔ امریکہ کو کتوں کی جنت بتایا جارہا تھا۔ سان فرانسسکو، شکاگو اور لاس انجلس میں کتوں کی آرائش کے لئے بنوائے گئے بڑے بڑے ہال

سنجیدگی سے، شمار کئے جارہے تھے۔ یہ ہوا کہ بات پھسل، کر دنیا کے مزدوروں پر آگئی۔ا، خبر ملی (خدا غارت کرے ان خبروں کو) کہ تمام دنیا کے مزدوروں میں ستر فی صدی مزدور کسی نہ کسی طرح جنگی کاموں میں مصروف ہیں اور روٹی کما رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم کے شور میں ایک آواز ایک اسکاٹ بڑے میاں کی بھی تھی جنھوں نے اپنی جوانی میں برٹرنڈ رسل کے ساتھ امن عالم کے لئے سڑکوں پر دھرنے دئے تھے وہ سب کو سمجھا رہے تھے۔

"آج دشمن کی اصل طاقت فوج میں نہیں اسکے شہروں اور اسکی منڈیوں میں ہے اور تباہی کی صورت یہ ہے کہ یہ لندن شہر ابھی جب آپ اسے کھڑکی سے جھانک کر دیکھیں تو یہ آپ کو بھاگتا دوڑتا دکھائی دے مگر جیسے ہی آپ جیب سے لائٹر نکالیں اور ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ جلانے کے لئے نگاہیں نیچے کر کے دوبارہ پھر کھڑکی کے باہر جھانکیں اور تب ایکا ایک پورا لندن شہر آپ کو ایک ملبے کا ڈھیر دکھائی دے تو آپ کیا کریں گے۔ ؟اوقات ہی کیا ہے اس شہر کی۔ پرکیولیٹر میں کافی شدت حرارت سے اُبل سی پڑی تھی اور میں تو جیسے غائب ہو چکی تھی۔

اسی وقت ایک صاحب جنکے پاس کم سے کم تین درجن پائپ تھے اور جنکی تین ہزار کتابوں کی ذاتی لائبریری تھی اور جو ہمیشہ ٹائی کے بغیر سوٹ پہنتے تھے اور جنکی تیسری بیوی آرٹسٹ تھیں اور شادی کئے بغیر انکے ساتھ رہتی تھیں وہ حاضرین کو امریکہ کے صدر سے خواب میں کئے گئے اپنے مکالمے سُنا رہے تھے، وہ خواب میں صدر سے سوال کرتے ہیں۔

"مسٹر پریسیڈنٹ آپ کس بات پر اسقدر اتراتے ہیں۔"

"جناب ہم اپنے علم وعرفان پر اتراتے ہیں۔" صدر جواب دیتے ہیں

"کیوں۔؟"

"اس لئے کہ علم پیسہ کمانے اور جنگیں فتح کرنے کی قوت فراہم کرتا ہے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ علم ہمیشہ آپ کے پاس نہ رہے۔؟"

"ممکن ہے۔" صدر جواب دیتے ہیں

"کیا یہ ممکن نہیں کہ جو علم آپ کے پاس ہے اس سے زیادہ علم دوسرے لوگ بھی حاصل کر لیں۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" صدر اقرار کرتے ہیں

"یعنی جو قومیں مفلس اور نادار ہیں کل وہ اپنے علم کی بدولت طاقت ور پر سبقت بھی لے

جاسکتی ہیں۔"

"ہاں، ایسا ہوا بھی ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ علم کی کثرت جتنی جلدی طاقت فراہم کرتی ہے اتنی ہی جلدی اسے چھین بھی سکتی ہے،"

"یہ درست ہے اور تجربہ بھی یہی کہتا ہے۔"

"آپ اپنے علم کے بل بوتے اب تک کتنی جنگیں لڑ چکے ہیں۔؟"

"سیکڑوں۔" صدر جواب دیتے ہیں

"ان جنگوں میں کتنی جانیں تلف ہو چکی ہیں؟"

"کروڑوں۔"

"جو لوگ کسی بھی پہلو سے آپ سے زیادہ علم حاصل کرلیں گے تو وہ کیا کریں گے۔؟"

"وہی جو ہم نے کیا ہے۔" صدر جواب دیتے ہیں

"پھر اس سے ثابت کیا ہوتا ہے؟" وہ صدر سے بھویں چڑھا کر سوال کرتے ہیں تو صدر بھی بھویں چڑھا کر جواب دیتے ہیں۔

"اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صدام حسین کو کویت پر اقتدار جمانے کی چھوٹ دے دینی چاہئے تھی۔" صدر کا جواب سنکر مکالمہ کرنے والا اپنے خواب سے بیدار ہو جاتا ہے اور اپنے پندھرویں پائپ میں تمباکو بھر کر پائپ سلگاتا ہے پھر کھیل ختم اور پیسہ ہضم ہو جاتا ہے۔ لیکن میں پہروں سوچتی رہتی ہوں کہ جس دیس سے میں آئی ہوں وہاں بھی علم کی چاہ بڑھتی جارہی ہے اور لوگ یہودیوں کی طرح مالدار ہوتے جارہے ہیں اور جمہوریت سب ہی کو علم حاصل کرنے کے لئے برابر کے موقع فراہم کر رہی ہے اور جنھیں یہ موقع نہیں مل رہا ہے انھیں انکی محرومیاں انھیں ڈھکیل کر یہ موقع حاصل کرنے کے نت نئے طریقے بتارہی ہے تب میں بھی خیالوں میں امریکہ کے صدر سے مکالمہ کرتی ہوں

مسٹر پریسیڈنٹ، کیا ہم بھی علم حاصل کرسکتے ہیں۔"

"یقیناً" صدر جواب دیتے ہیں۔ "جاپان تو ایک زمانے میں گھوڑے کی نال بھی نہیں بناپاتا تھا،"

"کیا ہم بھی پیسہ کماسکتے ہیں اور جنگیں جیت سکتے ہیں،" میں سوال کرتی ہوں

"بے شک۔ علم کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے" صابر جواب دیتے ہیں۔ اس رات بستر میں بدن پر کسی کپڑے کے بغیر میں شوہر کے ساتھ رات بھر سوتی ہوں اور صبح اس سے شکایت کرتی ہوں کے اسے فعال ہونے میں اب لمبے وقفے کیوں لگتے ہیں تو وہ مجھے حیرت سے تکتا ہے اور اسکا خیال ہے کہ مجھے خود کو کسی ماہر نفسیات کو دکھانا چاہئے۔

شام کو محشر ماموں سے خوب باتیں ہوئیں،

"ماموں ہم ہندوستان واپس آرہے ہیں۔" میں محشر ماموں کو بتاتی ہوں۔

"مجھے طلاق مل جائے گی اور میں لندن چھوڑ رہی ہوں۔"

یہ سب کتنے چھوٹے سے جملے میں کتنی آسانی سے کہہ دیا میں نے مگر ایسا کرنے میں جو پاپڑ بیلے ہیں انکا ذکر فضول ہے۔ ۴ سال پہلے میرے باپ کے پاس محشر ماموں کا ایک دوست داؤد میرے رشتے کی بات لیکر آیا تھا اور میرے باپ نے مجھے لندن کے ایک تاجر کے ہاتھوں بیاہ دیا اور پھر مجھے پتہ لگا کہ میں بیوی نہیں ایک ایجنٹ ہوں نشہ آور دواؤں کی ایک دلال۔ پھر زندگی کہ وہ ۴ سال کیسے کٹے۔؟

"اب ارادہ کیا ہے کمو؟"

"کافی پیسے کمالئے ہیں۔ بڑی چالاکیوں سے اپنے ملک میں اتنا پیسہ اتار لیا ہے کہ کام چل جائے گا۔

چاہتی ہوں کہ مسلمانوں کے پچھڑے پن کے لئے کچھ کروں۔"

پھر محشر ماموں رات گئے تک بتاتے رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نیا سر سید درکار ہے اور سر سید اخباروں میں اشتہار دیکر نہیں ملتا۔ نظریوں کی جنگ ختم ہو چکی مفادات کی جنگ ہے۔ قبر میں پیر لٹکائے بڑے بڑے ادیب اور دانشور راتوں رات اپنا قبرستان بدل دیتے ہیں۔ پھر محشر ماموں نے بتایا کہ مشاعروں کی کمائی سے انھوں نے دو منزلہ مکان بنوالیا ہے بینک بیلنس بھی ہے، شادی کے وہ قائل نہ تھے۔ صدر دروازے پر لوہے کا بھاری پھاٹک لگوا کر کہ کبھی فرقہ وارانہ فسادات میں بلوائی دروازہ نہ پھونک دیں وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔ ادھر وہ کافی خوش بھی رہنے لگے ہیں، اچھی شرابیں پیتے ہیں، گورنر سے صاحب سلامت خوب بڑھا رکھی ہے راج بھون کے ذریعے کی جانے والی ادبی اور تہذیبی تقریبات کے انتظامات اب محشر ماموں کے ہاتھ میں رہتے ہیں، سنا ہے ادیبوں کو سالانہ انعامات بھی وہی دلوانے لگے ہیں، دشمنوں کا کہنا ہے کہ انعامات کی آدھی رقم اکثر محشر

ماموں انعام پانے والے سے پیشگی ہی دھر الیا کرتے ہیں۔

میرے باپ نے مجھ سے ملنے کو منع کر دیا تو میں بہت روئی تھی۔ میں ان سے کہنا چاہتی تھی۔

"ہم مسلمانوں کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انہیں آزاد جمہوری ہندوستان کا با معنی شہری دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ایک دن محشر ماموں آئے انکے ساتھ آنے والوں میں تیس سال کا وہ مرد بھی تھا، کھلی کھلی آنکھیں، گہری اور دانے دار آواز ترشے ہوئے مگر بھرے بھرے ہونٹ، کندھے پر ایک جھولا پڑا ہوا اُلجھے بال صاف ستھرے پیروں میں کولھاپوری چپل بہت دیر وہ بیٹھا رہا ہم سب کے ساتھ۔ مجھے کئی بار ایسا لگا جیسے وہ مجھ میں خاصی دلچسپی لے رہا ہے تب ہی کی بات ہے وہ کئی کرسیوں سے گذرتا ہوا مجھے اخبار کی وہ عبارت سنانے آیا تھا۔ پھر محشر ماموں نے اس سے با قاعدہ میرا تعارف کرایا۔ اسکا نام اشوک تھا وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت پر بمبئی میں کسی فلم کے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔

اس وقت ہم لوگ سر سید کے حوالے سے ایسے تعلیمی مرکز کے قیام کے امکانات پر بات کر رہے تھے جو مسلم نوجوانوں کو جدید ہندوستان کی ضرورتوں پر پورا اترنے کے لائق بنا سکے۔

اشوک نے اس بیچ اخبار رکھ دیا تھا۔ کئی بار سر سید کے نام کی آواز جب اسکے کانوں میں پڑی تو وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ آخر کو وہ بول پڑا۔

"میری فلم کا ایک کردار سر سید کے مزار پر بھی جاتا ہے۔"

"اچھا۔" سب یکایک چونک پڑتے ہیں۔

"کیا آپ کو اسمیں دلچسپی ہے کہ وہ سر سید کی قبر کا کونا پکڑ کر کیا کہتا ہے۔؟"

"کیا کہتا ہے۔؟" جلدی سے لوگ سوال کرتے ہیں۔

اشوک اس مکالمے کو ذہن پر زور دیکر دھراتا ہے۔

"سر سید صاحب! میں آپ کی یونیورسٹی کی سیاست سے اور سیاست میں تفرقے سے اور تفرقے میں انتشار اور انتشار میں اسٹرائکوں اور اسٹرائکوں میں جو تم پیزار سے بچتا بچاتا بس ایک سوال کرنے آیا ہوں۔ جواب دیجئے کہ پورے ملک کے آئی اے ایس افسران کے دو ہزار نو سو انچاس ماموں کی فہرست میں صرف ساٹھ نام مسلمانوں کے کیوں تھے جبکہ ملک کی پوری آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۱۲ فی صد ہے۔ سر سید دادا! کیا آپ کو معلوم ہے کہ پبلک سروسز کے امتحانوں

میں آپکی یونیورسٹی کے جب اکتالیس طلباء بیٹھتے ہیں تو دوسری یونیورسٹیوں کے طالب علموں کی تعداد سیکڑوں اور ہزاروں میں ہوتی ہے۔"

اشوک بول کر چپ ہو جاتا ہے۔

سب لوگ اس کی فلم کے پروجیکٹ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں لیکن وہ فلم کی تفصیلات کو الگ ڈال کر سب پر برس پڑتا ہے۔

نوجوانوں کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانوں کی تیاریاں کیسے کی جاتی ہیں اور مقابلے کی دنیا میں جینے کے طور طریقے کیا ہیں، مسلمانوں کا نہ کوئی بینک ہے نہ تجارتی تنظیم نہ کوئی اسپتال ہے اور نہ کوئی صنعتی تربیت کا مرکز اگر میں یہ کہوں کہ بغل میں ایک سپارہ ہاتھ میں ایک بدھنی اور کندھے پر ایک جانماز لٹکا لینے سے ہی مسلمانوں کے مسائل حل نہ ہونگے تو آپکا مولوی میری ٹانگیں چیر کر پھینک دے گا۔"

دوسرے دن مختشر ماموں میرے باپ کا جواب لیکر آگئے۔ میرے باپ نے کہلوایا تھا کہ ستر چوہے کھا کر بلی حج کو نہیں جا سکتی۔ میری حرام کی کمائی کا ایک پیسہ بھی مسلمانوں کے فلاحی کاموں کے لئے حرام ہے انھوں نے اپنے خط میں مجھے لکھا تھا۔

"اخلاقیات کا مقصد اسلام میں آخرت کی زندگی سے رابطے کا ہے اور تو نے اس زندگی کے لئے کیا کیا؟ مسلمانوں کی اصلاح کا شوق کس منہ سے کر رہی ہے تو؟ کیا تجھے معلوم ہے کہ ایسی کوئی اصلاح اسلام کو قبول نہ ہوگی جو شریعت کے حدود سے باہر ہو۔ اے نامراد! کیا تجھے یہ باور کرانا پڑے گا کہ انسان کا اخلاقی نقطۂ کمال پر پہنچ کر ایک ابدی اور شعوری اختیار حاصل کرنے کا نام ہی جنت ہے۔"

وہ رات میں نے اپنے بستر پر ایسے کروٹیں بدل کر کاٹیں جیسے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔

میرا باپ ابدی اور شعوری اختیار کو جنت کہتا تھا

میرا باپ یہ بھی جانتا تھا کہ دوزخ ایک مستقل جبر کی کیفیت کا نام ہے۔ ایک داخلی آگ میں سلگتے رہنے کی ہیشگی۔

اشوک مجھ سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا میں نے دوسرے دن اپنے گھر پر بلایا۔ تب اس نے ایک میگزین دکھاتے ہوئے کہا تھا "چہرے غور سے دیکھنے کی عادت ڈالو تو ہندوستان سمجھ میں آ جائے گا۔ باتصویر رسالے اس سلسلے میں تمہاری مدد کریں گے۔ یہ چہرے دراصل ہماری جنگِ آزادی کے بعد تقسیم کئے گئے انعامات کے تمغے ہیں" پھر ایک صفحے پر نظریں گاڑ کر وہ مسکرایا تھا اور

صفحہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔

"آزادی سے پہلے کے یہ ہریجن لیڈروں اور منتریوں کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے چہرے ہیں، تروتازہ، ہشاش بشاش۔۔ ذرا اوالمیکیوں کی جھوپڑیوں میں جاؤ اور اُن چہروں کو اِن چہروں سے ملا کر دیکھو۔ جس رائے عامہ کے احترام میں رام نے سیتا کے ساتھ جنگلوں کے دُکھ جھیلے اسی رائے عامہ نے کونسی ووٹ کی سیاست کو جنم دیا ہے۔

کسی پڑھے لکھے کانگریسی ہندو سے پوچھو کہ ہندوستانی اخلاقیات کی سب سے بڑی روائت کیا ہے وہ جواب دے گا Positive Consensus مگر تاریخ ایک زندہ حقیقت ہے اور یہ چہرے بدلتی ہے ان چہروں کو پڑھو اور دیکھو کہ روائتوں کے نام ونشان کس طرح مٹ جاتے ہیں۔

میرے جی میں آئی کہ کہدوں کہ تمکو تو چہرے پڑھنے آتے ہیں مرا چہرہ کیوں نہیں پڑھتے۔ میں اس سے نہیں کہہ سکی کہ میری بپتا کچھ اور ہے۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ میں اپنے مسلمان ہونے پر جی بھر کر فخر کروں لیکن جو کچھ دیکھا ہے اور دیکھتی ہوں اور اسے لفظوں تیں بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتی وہ باوجود میری خواہش کے مجھے ایک پل کو اپنے مسلمان ہونے کا وہ فخر حاصل نہیں ہونے دیتا جیسا کہ میں چاہتی ہوں۔ ہمیشہ ایک طرح کا الگاؤ اور فاصلے کا کانٹا کھٹکتا رہتا ہے

پھر وہ رخصت کے وقت مجھ سے ہاتھ ملانے کے بہانے تادیر اپنی ہتھیلی کی گرماہٹ کو میری ہتھیلی میں جذب کر کے اور آنکھوں کی زبان میں ایک غیر معمولی اپنائیت کے لہجے کا اظہار کر کے میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تو اس رات مجھے اپنے بدن میں کچھ عجیب سی سر سراہٹیں محسوس ہوئیں میرے عزیزوں نے وطن میں واپسی پر جہاں خوش آمدید کہا وہیں مجھے رائے بھی دی

"دیکھو بیٹا بیٹھے بیٹھے کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے پہلے کوئی کام سوچو۔ ایک کوٹھی ہماری نظر میں ہے اسمیں ایک شاندار ہوٹل کھولا جا سکتا ہے۔"

اسی رات میری آنکھوں کے سامنے اس کوٹھی کا خوبصورت لان لہلہاتا ہوا نظر آیا اسکے بام و در کی قلعی جھلملا رہی تھی، میں ہونٹوں میں سگریٹ دبائے اپنی گاڑی سے اتر رہی ہوں ایک بیرا میری گاڑی کا دروازہ کھول رہا ہے ہوٹل کے کاونٹر پر میری ملازم Receptionist مسکرا کر میرا استقبال کر رہی ہے سارے کمرے مسافروں سے بھرے ہیں، پورٹیکو میں گاڑیاں آرہی ہیں غیر ملکی سیاح دھوپ کھا رہے ہیں کچن میں کام ہو رہا ہے تب ہی میرے گھر کی کال بل کی آواز نے مجھے ایک جھٹکہ دیکر میری خیالی دنیا سے باہر پھینک دیا۔

"اشوک جی آئے ہیں۔" آدمی آکر مجھے بتایا ہے

اُس دن میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"جو فلم تم بنانا چاہتے ہو اسکا مرکزی خیال کیا ہے؟"

"دو سطروں میں بس اتنا۔" وہ بولا "جس مشرقیت کی چاہ میں رام پنچ وٹی میں براجے اس مشرقیت کا دھیرج ٹوٹ چکا ہے۔ ہمیں اپنی مشرقیت کو Left oriented بنانا ہوگا،

یہ کہکر وہ چپ ہو گیا۔ لیکن کنکھیوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

"کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں کسی نئے احساس کو لفظ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

میں کچھ نہیں بول سکی۔ دراصل میں کچھ بولنے کی حالت میں تھی ہی نہیں۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم یہاں سے نکل لیں، فلم ایک زبردست میڈیا ہے۔ ان لفظوں کو اُس میڈیا کے ذریعہ تلاش کریں۔ تم میرے ساتھ ہوگی تو مجھے بَل ملے گا۔ بولو کیا تم میرا ساتھ دوگی۔" یہ تو اس نے خاصی بڑی بات کہہ دی تھی، کیا میں اسی لئے لندن سے آئی تھی۔

اسکی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا میرے پاس اسکے لئے کوئی جواب نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسکی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں یا پھر میں انھیں سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی کچھ دنوں وہ اسی طرح آتا رہا شرقی فلسفے کی روح میں اپنے عہد کے احتجاج کی گرمی تلاش کرتا رہا تب تک میں نے بھی جان لیا کہ لندن سے دولت اسمگل کرلانا ہی کافی نہیں ہوتا اور نہ فیشن کے طور پر کچھ سوچتے رہنا ہی کارآمد ہو سکتا ہے اور تب مجھے لگا کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔۔ بے نام بے حیثیت اور بے چہرہ عورت۔ شوہر کو تو میں چھوڑ ہی چکی تھی باپ بھی میرے لئے اجنبی ہو چکا تھا وہ لوگ جو کچھ کرنا چاہتے تھے میری سمجھ سے باہر تھے کہیں تو امان لینا تھی۔ میں بڑی تیزی سے ہوٹل کے کاروبار میں لگ گئی۔ اشوک بمبئی جا چکا تھا بہت دن گذر گئے۔ میرا ہوٹل کھُل گیا۔ ایک دن اشوک کا ایک خط آیا لکھا تھا۔

"بمبئی میں مقامی اور غیر مقامی باشندوں کا سوال روز تیز ہوتا جا رہا ہے۔ غربت سے نڈھال مقامی باشندوں کو انکے پرانے ہیروز یاد کرائے جا رہے ہیں اور میں کاغذ پر اپنی فلم کی تکمیل میں مصروف ہوں ایک سین چھوٹا سا تمکو سناتا ہوں۔ فسادیوں نے پریس کے ایک فوٹو گرافر کو پکڑ لیا ہے وہ اس سے معلوم کرتے ہیں کہ اسکا مذہب کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے، میرا مذہب انسانوں سے محبت کرنا ہے لیکن انھیں فوٹو گرافر کے اس جواب سے تسلی نہیں ہوتی۔

پھر وہ سب زبردستی فوٹو گرافر کے کپڑے اتارتے ہیں تب انہیں پتہ چلتا ہے کہ

فوٹو گرافر مرد نہیں، عورت ہے۔ فسادیوں کا سرغنہ اس بات سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

"واقعی تم تو ہمارے مذہب کی ہی نکلیں، ہم بھی انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور اب تم سے محبت کریں گے۔"

محبت شروع ہوتی ہے تو کیمرہ اُدھر سے ہٹ کر فوٹو گرافر کے بدن سے نوچے گئے کپڑوں پر ٹک جاتا ہے جو فرش پر ایک طرف پڑے تھے ان کپڑوں کی جیب سے ایک پاکٹ بک جھانک رہی ہے جسکا ٹائٹل ہے Education for human unity and world civilizastion

سنا ہے اشوک کی فلم آدھی ادھوری ڈبے میں بند پڑی ہے اور وہ ٹی وی کے لئے کسی کے ساتھ ڈراؤنی کہانیاں لکھ رہا ہے جنکے درمیان مین ٹوتھ پیسٹ اور صابن وغیرہ کے اشتہارات بھی دکھائے جائیں گے۔ لندن میں ایک لڑکی سب سے پوچھا کرتی تھی پرامیتھیوز نے جو آگ چرائی تھی وہ کیا ہوئی؟ ایک نیو کلئیر ونٹر ہے جو لمحہ امید پر چھایا ہوا ہے جسکے نیچے آہستہ آہستہ سب سرد ہوتا جارہا ہے۔ کیا آپ اس دنیا میں رہنا پسند کریں گے؟ کوئی نہیں، نہیں کہتا تھا سب ہاں میں جواب دیتے تھے۔

دن گذر رہے ہیں۔ میں اپنے روٹھے باپ کو منا چکی ہوں۔ وہ جسکو بھی اسلامی مدرسے کا چندہ مانگنے کیلئے بھیجتے ہیں میں چپ چاپ دے دیتی ہوں۔ میرے ہوٹل میں چہل پہل رہتی ہے۔ میں نے اپنی ماں کے لئے ایک گاڑی خرید دی ہے۔ مہینے میں ایک بار سارے رشتے داروں کو ڈنر پر بلاتی ہوں۔ محشر ماموں کبھی کبھی میرے کولھوں پر چڑھے گوشت پر چٹکی لیکر کہتے ہیں

"بس اب وزن زیادہ مت بڑھا۔۔"

تب مجھے خیال آتا ہے کہ میری پُرانی مہین اور نرم و نازک کھال کی جگہ اب ایک موٹی اور دبیز کھال چڑھ چکی ہے راتوں کو دیر تک جاگتی ہوں۔ صبح دیر تک سوتی ہوں، کبھی انکم ٹیکس کمشنر، کبھی سیلس ٹیکس انسپکٹر، کبھی یہ منتری کبھی وہ منتری کبھی آئی جی، کبھی ڈی آئی جی۔۔ ہوٹل کے کلچر کی بھیانک اخلاقیات میں کھال اگر موٹی نہ ہو تو کتنی مشکلیں آتی ہیں۔ موٹی کھالیں قیمتیں چکانا اور قیمتیں وصولنا خوب جانتی ہیں۔

کل کی کاروباری ڈاک میں ایک خط اشوک کا بھی تھا۔

لیکن میں نے ابھی کھولا نہیں ہے

کسی دن کچھ فرصت سے ہوئی تو کھولونگی۔

□□□

2237

اقبال مجید کی تحریریں 'دو بھیگے ہوئے لوگ'، 'پیٹ کا کیچوا'، 'ایک حلفیہ بیان'، 'جنگل کٹ رہے ہیں' سب کو میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ زندگی پر ان کی گرفت اور دروں بینی (INSIGHT) کا میں خاصہ قائل ہوں۔ ان کی تحریر کے ایک ایک جملے میں زندگی کے کتنے ہی تجربے لپیٹے ہوتے ہیں اور پھر دورِ حاضر کی عیّاریاں، چالاکیاں، دھوکے دھڑی کے ساتھ ساتھ زندگی کا ایک رنگ محل بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ وہ کلاسیکی تہذیب سے لے کر آج صارفیت تک کی ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں کہ بس دیکھتے رہ جائیے۔ یہ سلیقہ انھیں ان کی اس کمائی ہوئی زندگی سے ملا ہے جس میں مدّتوں انھوں نے بادیہ پیمائی کی ہے اور اسی وجہ سے ان کی کہانیوں اور ناولٹ میں یہ بالکل منفرد رنگ ہے۔ کاش اقبال مجید کسی دن 'اور نمک' جیسی دو چار مزید تخلیقات پیش کرتے اور ان میں کوتاہ قلمی نہ ہوتی تو اردو فکشن کے رنگ محل میں ایک انوکھے رنگ کا اضافہ ہوتا۔ جو اس 'کہانی' اور 'مکڑ جال' تحریروں کے دور میں کلاسیکیت، فن اور ادب کی تلاش میں گھومنے والوں کے لئے ایک پناہ گاہ بنتا۔

— سیّد محمد عقیل